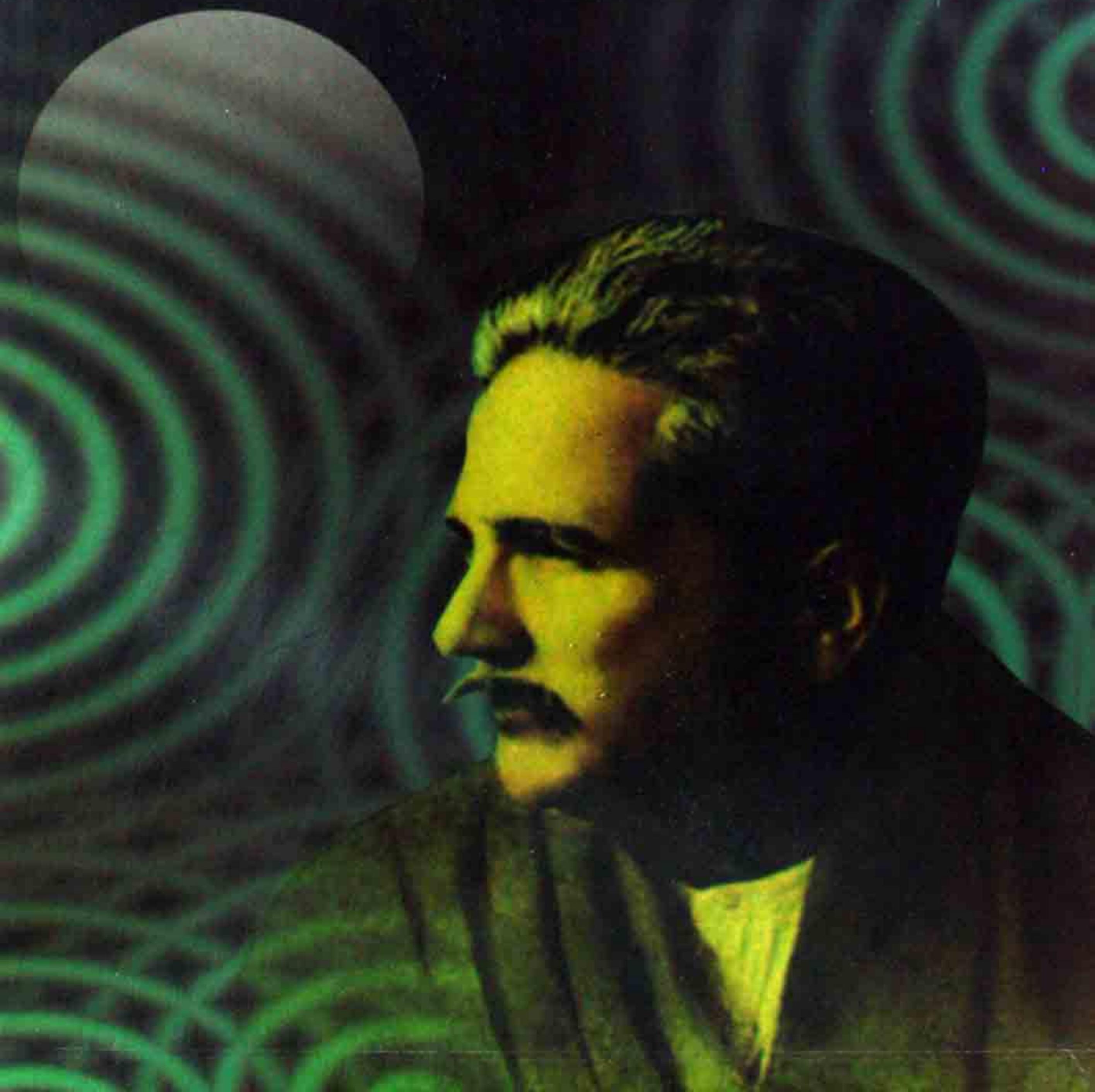


پاکستان سے اقبالیستان تک

پاکستان کا مستقبل اور اقبال

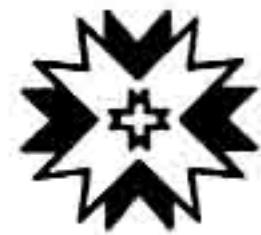
پروفیسر محمد عارف خان



پاکستان سے اقبالستان تک

پاکستان کا مستقبل اور اقبال

پروفیسر محمد عارف خان



مکتبہ جمال

تیری منزل، حسن مارکیٹ، اردو بازار، لاہور

نون: 0300-8834610 7232731

E-mail: maktabajamal@yahoo.co.uk

E-mail: maktaba_jamal@email.com

Special Thanks
Muhammad Iqbal (IKI)
for extenting cooperation to
published the book.

جملہ حقوق محفوظ ہیں

نام کتاب: پاکستان سے اقبالستان تک

مصنف: پروفیسر محمد عارف خان

اہتمام: میاں غلام مرتضیٰ اکھٹانہ

ناشر: مکتبہ جمال ۵ لاہور

مطبع: تایا سنز پرنٹرز ۵ لاہور

سال اشاعت: 2009

قیمت: 250 روپے

ملنے کا پتہ:

مکتبہ جمال

تیسرا منزل، حسن مارکیٹ، اردو بازار، لاہور

فون: 0300-8834610 7232731

E-mail: maktabajamal@yahoo.co.uk

E-mail: maktaba_jamal@email.com

انساب

ان نوجوانوں کے نام

جو ”اقبالستان مومن“ کو
”اقبالستان“ تک لے جا کر بزرگیم کے
تمام انسانوں کے خوف و غم سے
نجات کا باعث بنیں گے۔

فہرست

۹	مقدمہ
۱۳	بر عظیم کی مسلم تاریخ کے بطن سے ابھرنے والی تاریخی طاقتیں
۱۵	”ہندو اتا“ کی تاریخی بنیادیں (۱۸۵۷ء سے قبل)
۲۷	”ہندو اتا“ کی تحریکی بنیادیں (۱۸۵۷ء کے بعد)
۳۵	”ہندو اتا“ کی عملی بنیادیں (ما بعد ۱۹۸۰ء)
۴۱	بر عظیم میں اسلام کی آمد - I
۴۹	بر عظیم میں اسلام کی آمد - II
۵۵	مسلم سیاسی اقتدار کا خاتمه اور نئی سیاسی کشمکش
۵۹	مسلمانوں کی زندگی میں فیصلہ کرن تبدیلی
۶۳	مایوسی کے اسباب تاریخی، خارجی اور داخلی
۷۷	اقبالستان آئندہ کالائے عمل
۸۷	اقبالستان پاکستان کی تعبیرنو
۹۱	ہندو اتا فکر کے نقطہ نظر

پاکستان سے اقبالستان تک

اقبالستان.....ارض اقبالستان

۱۰۵

نصبِ لعین کے تعین میں لازمی عنانصر۔ ضرورت و اہمیت

۱۲۱

شرائطِ فکر و تعین فکر

۱۳۹

فکرِ اقبال و شرائطِ فکر

۱۳۵

فکرِ اقبال، ہی فکرِ مستقبل ہے

۱۶۳

مقدمہ

”پاکستان سے اقبالستان تک“ کا خیال و تصور اس تلاش و جستجو کی خواہش کا ایک اظہار ہے جو باقی رہنے اور آگے بڑھنے کے لیے مسلسل کسی منظم و منضبط سوچ و فکر کی تلاش پر زور دے رہی ہے۔ عمر اور علم کی مناسبت سے انسان کی فکر معرض ارتقاء میں رہتی ہے۔ انسان محدود سے لا محدود کی طرف محسوس فر رہتا ہے۔ ایک کہانی ختم ہوتی ہے تو دوسری شروع ہو جاتی ہے۔ برعظیم کی سطح پر اسلام کی آمد..... ماقبل اسلام برعظیم کی تہذیبی حالت..... بعد از اسلام تہذیبی اختلاط..... اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی مسلم ہندی تہذیب..... مسلم حکمرانوں کی آمد اور مسلسل حکمرانی..... اس کے نئے نتائج..... صوفیاء کی مساعی جمیلہ اور اثرات..... پھر یہ سب کچھ زوال پذیر اور انگریز کی آمد..... انگریز کی تہذیبی و فکری یلغار..... مسلمانوں کا اقلیت کا فلسفہ اور اقتدار..... ہندوؤں کی بلحاظ طاقت واپسی اور حکمرانی..... مسلمانوں کا اقلیت میں تبدیل ہونا..... مسلمانوں کے پورے تہذیبی وجود کو لاحق خطرات..... رد عمل میں تصور پاکستان کا ابھرنا..... علامہ اقبال کی فکری اور قائد اعظم محمد علی جناح کی عملی راہنمائی..... تخلیق پاکستان اور مسئلہ جموں کشمیر کا پیدا ہونا..... پاکستان کا بطور ریاست زیادہ کامیاب نہ ہونا..... ”ہندو اتنا“ کا بھارت میں سرکاری نعرہ بن جانا..... مسلمانوں کو ہندو بن کرنے ہنگامے یا قتل کیے جانے کی دھمکیاں..... تہذیبی نقوش مٹانے کے لیے با بربی مسجد کا انہدام..... خوف طاری کرنے کے لیے گجرات میں قتل عام..... ہندو مسلم تصادم کی فضائیہ کا برقرار رہنا..... واقعات و معاملات کی ایک مسلسل لڑی اور زنجیر ہے جس پر کام ہوتا رہا ہے، ہو رہا ہے۔ یہی راقم السطور کی سوچ کا بھی محور ہے۔

مٹ جانے کا خوف سوچ و فکر پر آمادہ کرتا ہے۔ باقی رہنے کا جذبہ جدوجہد پر آمادہ کرتا ہے۔ مسلمان بھی دوسرے انسانوں کی طرح کبھی ست ہو کر دشمن کو موقع فراہم کرتا ہے لیکن منہ سے پہلے متحرک ہو کر دشمن کے عزم خاک میں ملا دیتا ہے۔ اب کی بار خطرات بہت گہرے ہیں۔ دشمن طاقتور اور چاق و چوبند ہے۔ ہندی مسلمان پر جوش دکھائی نہیں دیتا۔ نصب العین سے عاری

محسوس ہوتا ہے۔ آگے بڑھنے کے لیے امنگ اور دلوں نہیں پاتا۔ وقت آگیا ہے کہ ہم ہندوستان کے تناظر میں اپنے سارے وجود اور مطلوب کائنے سرے سے جائزہ لیں۔ غور و فکر کریں۔ لا جائے عمل مرتب کریں۔

عزائم کو بروئے کار لائیں۔

تحقیق اور غور و فکر کے بنیادی سوالات کوئی شکل دینا از بس ضروری ہے۔ چند بنیادی سوالات ناقص کے نزدیک یہ ہیں۔

- ۱۸۵۷ء بريطیم پاک و ہند میں مسلمانوں کے اقتدار کا خاتمه اور اس کے زوال کی تکمیل کا سال تھا۔ اس زوال کے اسباب اور تکمیلی واقعات کا تجزیہ مستقبل کی فکر مندی و منصوبہ بندی کے لیے لازمی ہے۔

- انگریز کے پورے ہندوستان پر اقتدار کے تہذیبی، سیاسی، معاشی اور سماجی اثرات کی نوعیت اور نتائج کا تعین ضروری ہے۔

- ۱۸۵۷ء ہندوؤں کا یوم واپسی کیوں اور کس طرح ہے؟ اس بات کا تجزیہ ہندو قوم کے افکار و عزم کو سمجھنے میں مدد دے گا۔

- بريطیم پاک و ہند میں ہندوؤں کی آمد، مسلمانوں کی آمد اور انگریزوں کی آمد کے مقابلی اثرات اور ان کا جائزہ۔

- ”ہندو اتا“ کا نظریہ ہندو قوم کا بطور نصب العین اپنے تکمیلی مرحل کی طرف کامیابی سے روای دواں ہے۔ اس کا تدارک کیسے ممکن ہے؟

- ”ہندو اتا“ کے نظریے کو سرکاری سطح پر آشیرباد حاصل ہو جانے کے بعد بابری مسجد کی شہادت اور گجرات میں ریاستی سرپرستی میں مسلمانوں کے قتل عام سے خوف اور مٹا دیئے جانے کے پیغامات اگر مسلمانوں کو مایوسی کی طرف دھکلیتے ہیں تو اس کا ممکن جواب کیا ہے؟ نئے بد لے ہوئے اور بدلتے ہوئے حالات کے تناظر میں مسلمانوں کی بريطیم میں حیثیت اور مقام کا تعین کیونکر اور کیسے ممکن ہے؟

- تصور پاکستان جامد تصور ہے یا اس میں آگے بڑھنے کے امکانات بھی پائے جاتے ہیں؟ محک تصور پاکستان علامہ محمد اقبال کی فکر کا ماضی، حال اور مستقبل کے تناظر میں تجزیہ، کہ کوئی اور اقبال جنم نہ لے سکا اور مسلمانوں کو اب پھر راہنمائی کی ضرورت ہے۔ کیا یہ ضرورت اقبال کی فکر سے ایک بار پھر پوری ہو سکتی ہے؟

اقبال کے تصور پاکستان میں کیا تصور اقبالستان بھی پوشیدہ ہے؟
کیا تصور اقبالستان ”ہندو اتا“ کا توڑ بن سکتا ہے؟

کیا تصور اقبالستان فکر مستقبل کے حوالے سے برعظیم کے مسلمانوں کا نصب لعین بن سکتا ہے؟
کیا اقبال کی فکر کی تشكیل نواس عزم کے ساتھ ممکن ہے کہ ”فکر اقبال فکر مستقبل“ ہے۔

یہ اور اس طرح کے بہت سے سوالات ابھرتے ہیں جن کا جواب دیا جاتا بھی رہا ہے مگر اب مزید سنجیدگی کی ضرورت ہے۔ یہ سوالات اہل بصیرت کے جواب کے متلاشی ہیں۔ ان سطور میں ان سوالات کی ایک حد تک نشاندہی کر کے محض وضاحت کی کوشش کی گئی ہے۔ یہ اداروں کے تحت اہل دانش و بصیرت کی ایک جماعت کا کام ہے۔ تصور اقبالستان دراصل توجہ دلانے کی کوشش ہے کہ غور و فکر کی کمی بنیاد میں ممکن ہو سکتی ہیں۔ آگے چل کر سچائی اپنے راستے خود بنالیتی ہے مگر آگے بڑھنا شرط ہے۔

”پاکستان“ کو ان سطور میں ایک جامد ریاست کے تصور سے باہر نکالنے کی بھی نشاندہی کی گئی ہے؟ تا کہ پاکستان متحرک ہو کر ثابت را ہوں پر جدوجہد کو استوار رکھے۔

ان سطور میں ”ہندو اتا“ کے تصور و عمل کے تحت آگے بڑھنے کی ہندوانہ سعی اور بھارتی ریاست کے کردار کو بنیاد بنا کر اس کے مقنی پہلو کو اجاگر کیا گیا ہے۔ اس سے ہندو مت یا ہندوؤں کی کردار کشی مقصود نہیں ہے اور نہ ان کے اس حق کو مسترد کیا گیا ہے کہ وہ ہندو مت کے تحت بھارتی ریاست نہ چلا میں۔ یہ انسانی و مذہبی حق اپنی جگہ مسلم۔ ”ہندو اتا“ کے جس پہلو کو اجاگر کر کے ہندو مت اور بھارتی ریاست کے جس پہلو کو ہدف تنقید بنایا گیا ہے۔ وہ دوسروں کو مٹا دینے کا ہندوانہ عزم ہے جو غلط ہے۔ کوئی اقلیت وہ مسلمان ہوں، عیسائی ہوں، سکھ ہوں یا چند دوسری اقلیتیں بلکہ خلیلی ذات کے ہندو تک مٹ جانا گوارا نہیں کریں گے۔ ”ہندو اتا“ تصور کے تحت بھارت اقلیتوں پر جس قدر دباو بڑھائے گا اس کے مقابلے میں مراحت پیدا ہوگی اور بھارتی ریاست کے معاشرتی ڈھانچے کو بے سکون اور منتشر کرے گی۔ ان سطور میں اس خواہش کا اظہار ہے کہ مراحتوں کو ہوادینے کے بجائے کم کرنے کی سبیل نکالی جائے۔ عمرانی نقطہ نگاہ سے اکٹھے رہنے کے راستے تلاش کیے جائیں۔ دوسری یہ وضاحت مناسب معلوم ہوتی ہے کہ ان سطور میں کسی ریاست، قوم، اکثریت یا اقلیت کی توہین مقصود نہیں ہے۔

ان سطور میں جموں و کشمیر کا مسئلہ زیر بحث نہیں ہے۔ لیکن برعظیم پاک و ہند کے کروڑوں انسانوں اور بھارتی، پاکستانی اور بنگلہ دیشی ریاستوں پر چھپلی نصف صدی سے زائد اثر انداز ہو رہا

ہے۔ سوچوں کی بنیاد میں جموں کشمیر کی بنیاد پر اوپر اٹھتی ہیں۔ ریاستی پالیسیاں جموں کشمیر کو محور بنانے کے بنتی ہیں۔ ”ہندو اتا“ کی سوچ میں زیادہ تیزی کا ایک سبب جموں کشمیر بھی ہے جو بھارتی ریاستی پالیسی کا ایک حصہ تھا۔ بھارتی ریاست نے اسے ایک ہتھیار کے طور پر دشمن کے خلاف نفرت کے لیے استعمال کیا جبکہ دوسری طرف جموں کشمیر میں جاری شدید مزاحمت و جدو جہد اور پاکستان کو ایک متحرک ریاست کے طور پر آگے بڑھنے کے لیے دباؤ بھی جموں کشمیر کی مزاحمتی تحریک کے اثرات کا نتیجہ معلوم ہوتا ہے۔

یہ بات عام ہندو کو معلوم ہے نہ عام مسلمانوں کو، کہ مزاحمت و کشمکش میں عام انسان مزید تنگ دست ہوتا ہے۔ اس کی مشکلات بڑھ جاتی ہیں۔ یہ سب کچھ نصف صدی سے اوپر کے عرصے میں جموں کشمیر کے عوام کو اپنا فیصلہ آپ نہ کرنے سے روکنے پر ہوا ہے۔ دونوں طرف اتنا کے بت کوہ ہمالیہ سے بلند تعمیر کر لیے گئے ہیں۔ اس چوٹی سے کوئی بھی نیچے آنے کے لیے اس لیے تیار نہیں کہ کہیں پھسل ہی نہ جائے۔ اس وہم سے نکلنے کے لیے جس دلیری کی ضرورت ہے۔ بد قسمتی سے یہ دونوں اطراف میں ناپید ہے۔

تحریر کوئی بھی ہو، ایک وقت لیتی ہے۔ ان سطور میں زیر بحث تصور کو غور و فکر کی بنیاد بنا کر کتابی صورت تک لانے میں بھی خاصا وقت لگا ہے۔ دیانتداری سے لکھا جانا اپنی جگہ لیکن فیصلہ قاری کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ آپ حضرات کی آراء میرے علم میں اضافے کا سبب بنیں گی، آراء کو خوش آمدید کہوں گا۔

وہ دوست جو اس تحریر کو یہاں تک لانے میں معاونت کرتے رہے۔ ان میں سرفہرست پروفیسر غازی علم الدین شعبہ علوم اسلامیہ عربی پوسٹ گریجویٹ کالج میر پور آزاد کشمیر ہیں جنہوں نے نہ صرف پروف ریڈنگ جیسا مشقت والا کام کیا بلکہ دوران تحریر اپنے قیمتی مشوروں سے بھی نوازتے رہے۔ اس کے بعد میں پروفیسر محمد رفیق بھٹی ریٹائرڈ پرنسپل جو خود بھی کئی کتابوں کے مصنف ہیں، کاشکریہ ادا کروں گا جنہوں نے آخر پروف پڑھ کر قیمتی مشوروں سے نوازا۔

پروفیسر محمد عارف خان
ڈاکٹر یکمیر

میاں محمد بخش پبلک لائبریری، میر پور، آزاد کشمیر

بر عظیم پاک و ہند

کے ماضی سے ابھرنے والی تاریخی طاقتیں

۱۔ ہندو تاریخی درشت

۲۔ ہندو اتاتا

۳۔ بھارت

۱

ہر مذہب، عقیدے اور تہذیب میں صداقت و سچائی کا عضر غالب ہوتا ہے۔ یہ اس مذہب و عقیدے کے ماننے والوں پر منحصر ہوتا ہے کہ وہ غالب عضر کو ثابت مقاصد کے لیے کس قدر انسانیت کی بنیاد پر آگے بڑھاتے ہیں یا وہ مخفی را ہیں زیادہ اختیار کر لیتے ہیں۔ ہندو مذہب ان ملے جلے تاثرات کا عکس ہے۔ ہندو مذہب بہت قدیم مذہب ہے۔ اس نے انسانیت کے سفر میں گراں قدر خدمات سر انجام دی ہیں۔ اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ اُس نے اپنے اس سفر کو کامیابی سے جدید دور تک طے کیا ہے۔ ہندو دھرم کے رواداری اور عدم تشدد کے پہلو اور دوسرے مذاہب و عقائد کو غیر محسوس طریقے سے اپنے اندر جذب کرنے کو تاریخی سرمایہ اور رورٹے کے طور پر بیان کیا جاتا ہے۔ بدھوں کے قتل اور ہندوستان سے انہیں بے دخل کرنے کا تاریخی واقعہ اور اب مسلمانوں کے خلاف اُسی طرح کارویہ رواداری کے تاثر کی تائید نہیں کرتا لیکن یہ درست ہے کہ غالب عضر عدم تشدد اور رواداری جیسے افکار کو ہی قرار دیا جا رہا ہے۔

روایت اور جدیدیت کی تازہ کڑی "ہندوata" ہے۔ تاریخ ہند کے ایک خاص مگر انتہائی نازک موڑ پر ہندوata کو ایک خاص فلکر، سمت اور حکمت عملی سے منسلک کر دیا گیا ہے۔ ہندوؤں کو تاریخ کے ایک اہم موڑ پر کسی طرح یہ باور کر دیا گیا ہے کہ مسلمانوں کے دور اقتدار میں ہندوؤں کے ساتھ امتیازی برداشت کیا گیا تھا۔ خوشونت سنگھٹ کے نزدیک اس الزام کے شواہد سرے سے موجود نہیں۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ ہندوata کی یہ فلکر، سمت اور حکمت عملی نتیجہ خیز عمل کے ساتھ آگئے بڑھ رہی ہے۔ ہندو قومیت کے ساتھ اسے جوڑ کر اس کی نموکی صلاحیت میں اضافہ کر دیا گیا ہے۔ اس کو ہوا کا تازہ جھونکا قرار دے کر تازہ دم اور پر جوش بنادیا گیا ہے۔ کانگرس اور اس کا رواداری اور سیکولر ازم کا نعرہ "ہندوata" کے تازہ دم نعرے کے سامنے نہیں نہ پھر سکا۔ یہی وجہ ہے کہ بھارتی جنتا پارٹی کو مقبولیت اور پھر اقتدار بھی اسے ملا۔

"ہندوata" کو عملی اور نتیجہ خیزی کے عمل سے گزارنا بھارت ہے۔ مہا بھارت ہندوؤں کی مذہبی کتاب سے ماخوذ یہ نام بھی پاکستان کی طرح ایک مذہبی تعلق کی عکاسی کرتا ہے۔ ہندوستان کے اصل وارث ہندو ہیں۔ مسلمان حملہ آور اور خارجی لوگ ہیں۔ خوشونت سنگھٹ کے نزدیک سا اور کر پہلا شخص ہے جس نے ہندوؤں اور مسلمانوں کو دو الگ الگ قومیں قرار دے کر مسلمانوں کے بغیر "ہندوata" اور دو قومی نظریے کی بنیاد رکھی۔ اسی قوم پرستی کی فلکر کو آگے بڑھانے کے لیے بھارت میں دوسرے مذاہب خصوصاً مسلمانوں کی طرف سے ہندو راجاؤں کی میدانی جنگ میں مذکور، ہندو مندروں کی بربادی، غیر مسلموں پر جزیہ اور دوسرے درجے کا شہری بنائے رکھنے کے اقدامات کا منظم تنظیموں کے ذریعے پر اپیگنڈہ کیا گیا۔ بھارت کا تازہ مطلب یہ ہے کہ ہندو قومیت کی بنیاد پر کار بند رہنے والوں کے سوا باقی لوگوں کے بھارت میں رہنے کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ یقیناً بھارت کا نیا چہرہ جدید دور کے تقاضوں کا منہ چڑانے کے مترادف ہے۔

بر عظیم کی مسلم تاریخ کے بطن سے اُبھرنے والی تاریخی طاقتیں

۱۔ مسلم تاریخی ورثہ

۲۔ فکر اقبال

۳۔ پاکستان

۱

صوفیائے ہند کی مذہب کے تعصب سے پاک خالصتاً انسانی محبت کی بنیادوں پر تبلیغانہ مساعی جمیلہ، بعض مسلم حکمرانوں کی انسان دوست حکمرانی، علماء ہند کی اصلاح مذہب اور میدان روایت میں ترویج و ترقی کی سعی، اہل قلم و بصیرت کی تحقیق و تحریر میں جانفشنائی اور مسلمانوں ہند کی بے مثل مجاہداتیہ قربانیوں اور شہادتوں کا شمر مسلم تاریخی ورثہ ہند ہے۔ اس سارے قضیے کے عمل و نتائج کو ہم دوسرے زوایہ نگاہ سے مسلم ہندی تہذیب کا نام دیتے ہیں۔ مگر ان سطور میں یہ زوایہ نگاہ زیر بحث نہیں ہے۔

تاریخی ورثہ، جو تاریخی روایت کا حامل، حاصل اور تسلسل ہوتا ہے، ایک زنجیر کی مانند ہوتا ہے کسی بھی دور میں روایت کی یہ کڑیاں ٹوٹ جائیں، غائب ہو جائیں تو تاریخی ورثے کی قوت کمزور ہو جاتی ہے۔ کمزور تاریخی ورثہ کسی شاندار قوم کی بنیاد نہیں بن سکتا۔ قوم کی ہر نسل اپنی تاریخی روایت سے آنے والی تبدیلیوں کو مد نظر رکھتے ہوئے، اپنے وقت کی دوپھر میں بینچ کرتا زہ فکر اخذ کرتی ہے اور تبدیلیوں کے عمل کو تازہ فکر سے جوڑ کر آگے بڑھنے کی راہ متعین کرتی ہے۔ فکر کی یہ تازہ آڑی اگلی نسل کے لیے روایت کا حصہ بن جاتی ہے۔

۲

روايت اور جدیديت کی تازہ کڑی فکر اقبال ہے۔ تاریخ ہند کے ایک خاص مگر انہائی تازہ کردار پر عصر جدید کی دو پھر میں بیٹھ کر واقع ہو جانے والی تبدیلیوں کو مد نظر رکھتے ہوئے ایک نتیجہ خیز فکر، سمت اور حکمت عملی فکر اقبال ہے۔ یہ فکر، یہ سمت اور حکمت عملی نتیجہ خیز عمل کے ساتھ روایت دواں اور تازہ دم نظر آتی ہے۔ اس کے اندر نہ کسی ساری صلاحیت ابھی پوری طرح تازہ دم اور لوں لے انگیز نظر آتی ہے۔ شائد یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں کے ہندی آسمان پر اقبال کے بعد کوئی اور ستارہ چکا بھی نہیں۔ اقبال کی فکر تاریخی دوری سے ابھری ہے۔ روايت کے خیر سے اُنھی ہے۔ اسی لیے شائد لوں کو مسخر کرتی ہے۔ روح کو تڑپاتی ہے۔ جذبوں کو جگاتی ہے، جدوجہد پر آمادہ کرتی ہے اور نتائج دیتی ہے۔

۳

ہند میں مسلمانوں کے باقی رہنے اور آگے بڑھنے کا آخری نتیجہ خیز عمل پاکستان ہے۔ یہ ہند کے مسلمانوں کے تاریخی دوری کی تازہ کڑی ہے۔ اب یہ کڑی مستقبل کی بنیاد بھی ہے۔ اقبال کی فکر کا پہلا نتیجہ بھی ہے۔ پاکستان، ہند کے مسلمانوں کی آخری منزل ہے اور نہ اقبال کی فکر کی انہا ہے۔ پاکستان، ہند کے مسلمانوں کی ابتدائی منزل ہے، آخری ہرگز نہیں۔ اسی طرح پاکستان اقبال کی فکر کی آخری منزل بھی نہیں، بلکہ پہلی منزل ہے۔ ”اقبالتان“، اگلی منزل ہو سکتی ہے۔

ہندوата کی تاریخی بنیاد میں..... (۱۸۵۷ء سے قبل)

ہندوستان وہی ہے۔ اس کی زمین ویسی وہی ہے۔ اس کے بنے والے بھی وہی لوگ ہیں جو مختلف نسلوں، زبانوں، رسموں اور مذہبوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ انسان نے شعوری لحاظ سے ترقی بھی بہت کر لی ہے۔ مگر یہ سب کچھ ہونے کے باوجود ہندوستان میں انسانوں کے لیے اکٹھے رہنا پہلے سے زیادہ دشوار ہو چکا ہے۔ عمرانی نقطہ نگاہ سے لگتا ہے کہ ہندوستان کے لوگوں نے زیادہ نہیں سیکھا۔ شامد اسی لیے تیری دنیا کے نفرت آمیز لقب کے مستحق ٹھہرے ہیں۔ بھارت و پاکستان بنا، دو خود مختار ریاستیں بنیں مگر ایک دوسرے کو گرانے پر سب کچھ لٹانے کی حکمت عملی دونوں ممالک نے گزشتہ نصف صدی سے زائد عرصہ سے اپنارکھی ہے اور یہ انسانوں کی قیمت پر ہے۔ BJP کی حکومت نے بھارت میں آنے کے بعد ”ہندوата“ کو بطور نصب العین اپنالیا ہے۔ گویا ہندو مت نے اپنے سفر کے اس موز پر ”ہندوата“ کو بطور نصب العین اپنا کر اپنے مستقبل کے سفر کی صفت بندی کی ہے۔

ہندو مت کے سابقہ تاریخی سفر اور موجودہ نصب العین یعنی ”ہندوата“ میں ایک جو ہری فرق جو ہری بم کی صورت اختیار کر کے برعظیم میں بنے والے تمام مذاہب کے انسانوں کے لیے خوف کا باعث بن چکا ہے۔ ”ہندوата“ اپنے ماننے والوں کے علاوہ سب کو مٹانے کا اعلان ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دوسرے مذاہب والوں نے اپنی بقا کے لیے سوچ و بچار شروع کر دی ہے۔ اپنی بقاء کے لیے سوچنا انسانی حق ہے۔

ہندو مت کی ابتدائی تاریخ اور بعد کے تاریخی نتائج کی روشنی میں یہ تصور کیا گیا کہ ہندو مذہب جذب و انجداب کی صلاحیت اور کیفیت کے ساتھ بغیر کسی مزاحمت کے تعلق برقرار رکھنے اور آگے بڑھنے کی فکر پر کاربند رہتا ہے۔ لیکن دو تاریخی واقعات اس کی تردید کرتے ہیں۔ بدھ مذہب کو جذب و انجداب سے نہیں بلکہ بدھوں کو قتل عام کر کے مٹایا گیا اور جو نجگے وہ

اطراف کے ممالک میں آج بھی موجود ہیں۔ ”ہندوata“ کا نیا فلسفہ ہندومت کو نہ مانے والوں کی قطعی نفی اور انہیں مٹا دینے یا باہر نکال دینے کے اعلان پر مشتمل ہے۔ یہ فکر ہندومت کے سابقہ تاریخی سفر کے بالکل عین مطابق ہے۔ بلکہ ”ہندوata“ ایک نیا مزاحمتی باب ہے۔

”ہندوata“ کا نیا مزاحمتی کردار مسلمانوں کو بنیاد بناتا ہے۔ لامحالہ جب مسلمانوں کو ہندومت قبول کرنے یا مٹا دینے کا پیغام دیا جائے گا تو مزاحمت اس کا قدرتی رد عمل ہو گا۔ ”ہندوata“ کا دوسروں کو مٹا دینے کا اعلان دراصل تاریخ کے ایک خاص دور میں اُس کی ناکامی کا رد عمل بھی ہو سکتا ہے۔ کیونکہ ہندومت کی تاریخ میں دوسرا کوئی مذہب سماجی سطح پر زیادہ دیراپنی شناخت برقرار رکھا نہیں رکھ سکا۔ یہ اسلام تھا کہ جس نے یہاں اپنے دور کے بعد نہ صرف اپنی شناخت کو برقرار رکھا بلکہ ہندومت پر بھی گہرے اثرات مرتب کیے۔ یہی وجہ ہے کہ برعظیم کے حوالے سے اب ہندومت اور اسلام دو مسلمہ مذاہب کے طور پر دنیا میں پہچانے جاتے ہیں۔ ”ہندوata“ کا نیا مزاحمتی فلسفہ دراصل جذب و انجذاب کے عمل کی ناکامی کے بعد اگلامرحلہ ہو سکتا ہے۔

دوسری طرف مسلمانوں نے ہندوستان پر ۱۲ سال حکومت کی۔ ہندومت کو مٹا دینے کی کوئی حکمت عملی تاریخ سے ثابت نہیں ہوتی۔ BJP نے ۱۹۸۳ء سے جن اقدامات کو اچھا ل کر مسلمانوں کے خلاف نفرت کو ہوا دی اور اپنا سیاسی قد کاٹھ بڑھایا ہے۔ وہ واقعات اگر درست بھی ہوں تو وہ اجتماعی یا حکومتی نہیں تھے اور نہ کبھی مسلم حکومتوں نے یہ انداز اختیار کیا۔ BJP اور ہندوata کے نعرے سے پہلے کانگرس کی طویل حکومت بھارت میں رہی ہے اور بھارت میں بے شمار ہندو مسلم فسادات ہوئے۔ کئی علاقوں میں نسل کشی کی حد تک فسادات ہوئے۔ مگر مسلمانوں نے یا پاکستان نے یہ تصور نہیں کیا کہ یہ حکومتی منشور ہے۔ کیونکہ کانگرس کا منشور مذہبی منافر ت پر نہیں تھا۔ ہو سکتا ہے کہ ان میں سے کئی لوگوں کی خواہش داخلی طور پر ”ہندوata“ طرز کی ہوئی ہو۔ ۱۹۸۳ء میں پولیس کی موجودگی میں سکھوں کا بڑے پیمانے پر قتل عام اور چند سال قتل گجرات میں مسلمانوں کے منظم قتل میں وہاں کے وزیر اعلیٰ کا ملوث ہوتا ”ہندوata“ کے تصور کی تحریک نظر آتی ہے۔ جبکہ ایودھیا میں با بڑی مسجد کو ہندوؤں اور حکومت کی ملی بھگت سے گرا یا جانا دراصل مسلمانوں کو مٹا دینے کے خوف کو بڑھانے کی ایک علامت کا اظہار ہے۔ یہ نفیاٹی حرbe ہے جس، جو سماجی تبدیلیوں کو اپنے حق میں لانے کے لیے استعمال کیے جاتے ہیں۔

ہندوستان اور آریہ

ہندوستان تاریخ کا ایک طویل سفر طے کرنے کے بعد جدید دور میں داخل ہو چکا ہے۔ اور آئندہ کی صفت بندی بھی کر چکا ہے۔ بات جو مسلمہ طور پر تسلیم کی جاتی ہے کہ پہلے پہل بر عظیم پاک و ہند میں جو قوم داخل ہوئی، وہ آریہ تھے۔ اور یہ بھی طے شدہ بات ہے کہ ہندوستان بھی آریہ نسل کے ذریعے ہندوستان میں داخل ہوا۔ ہندوستان کے مقامی لوگ دراوڑی نسل کے لوگ تھے، جن کا مذہب آریہ کے داخلے سے پہلے ہندوستان نہیں تھا۔ آریہ قوم لگ بھگ دو ہزار سال قبل مسیح سے وقوف و قفوں سے کئی لہروں میں داخل ہوئی، ظاہر ہے صد یاں گزر جائیں تو بہت کچھ بدل جاتا ہے، ہر دفعہ یقیناً یہ لوگ اپنی زبان، اپنی رسومات اور اپنے عقائد و مذہب لاتے رہے ہوں گے۔ جو پہلے آئے وہ چند صد یاں بعد مقامی ہو گئے اور جو بعد میں آئے، ان کی مزاحمت بھی کی اور انہیں بدیکی بھی قرار دیا۔ جبکہ نئے آنے والے زیادہ تازہ دم ہوتے تھے، وہ پہلے سے مقیم لوگوں پر حاوی ہوتے قتل کر دیتے یا مغلوب کر لیتے تھے۔ تاریخ کی یہی داستان ہے۔ آریہ نسل کی تاریخ کی پہلی کڑی ہندوستان تھی اور آخری کڑی اسلام ہے۔ جن راستوں سے ہندوستان بر عظیم میں داخل ہوا، تقریباً وہی سمت اور راستے اسلام نے اختیار کیے۔ اگر ہم ماضی قریب میں اس کا مظاہرہ دیکھیں تو وسط ایشیاء اور افغانستان میں جنگ نے لاکھوں لوگوں کو بر عظیم میں داخل ہونے پر مجبور کر دیا ہے۔ ہم نے ان کو پر دیکی سمجھا اور اپنے آپ کو مقامی سمجھا۔ بہت سے لوگ افغانستان و اپسی پر گامزن ہیں۔ مگر بہت سے اب یہاں ہی کے ہو کر رہ گئے ہیں اور وہ اب مقامی ہو گئے ہیں۔

پروفیسر عزیز احمد لفظ آریہ کے معنی عالی مرتبہ لکھتے ہیں اور زیادہ تر یہ لفظ دیوتاؤں سے منسوب کیا جاتا تھا۔ جونسکرت اور ژند ڈونوں زبانوں میں استعمال ہوتا تھا۔ ٹوٹی، ڈی کوئی آریہ کو ایک زبان کے تعلق کی بننا پر آریہ کہتے ہیں۔ اور ان کے نزدیک وسط ایشیاء، ایران و مصر میں یہ زبان بولی جاتی تھی اور دوسرے ہزار سالہ عہد قبل مسیح سے لے کر آگے تک ”ہندوستانی ایرانی“ لوگوں پر آریہ کا اطلاق کیا جاتا رہا۔ یہ جنگجو قسم کے لوگ ایک جگہ سے دوسری جگہ تیزی سے پہنچ جاتے تھے۔ دو بڑی افواج جن کا وطن موجودہ ازبکستان قرار دیا گیا ہے، کا ورود بر عظیم میں ہوا۔ جبکہ رشید اختر ندوی انگریز محققین کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ یورپ اور ہندوستان دونوں طرف آ کر آباد ہونے والے آریہ لوگ ہی تھے۔ اور اصلی وطن ان کا وسطی ایشیاء ہی قرار دیا ہے۔ وسطی

پاکستان سے اقبالستان تک

ایشیاء ہی آریا کا اصلی وطن قرار دینے میں لیسن ۱۸۳۷ اگرہ ۱۸۳۸ اور میکس مولر ۱۸۵۹ کا تذکرہ کیا ہے اور اس صراحت کے ساتھ کہ ہندوستان میں وہ چودھویں صدی قبل مسح میں داخل ہوئے۔^۱
ولڈیورنٹ نے مارشل کے حوالے سے لکھا ہے:-

”سنده اور پنجاب میں موجود آثار میں اور چار ہزار سال قبل مسح کی ترقی یافتہ شہری زندگی کا پتہ دیتے ہیں،“^۲ کینیڈی نے مذہب کے حوالے سے دیوتاؤں کی پرستش ان سے منسوب کی ہے جبکہ بڑے لے کیتھو دیدک برہمنوں کی طرف سے قدرت کے عظیم عنان صرکوبتوں اور معبدوں کی شکل دی جن میں دائیوس، پرتوی اور وردنا زیادہ مقبول تھے۔ پرتوی دیوی دھرتی ماتا کی قوتوں کی مظہر تھی۔^۳ پنڈت جواہر لال نہروں کے نزدیک قدیم زمانے میں کچھ لوگ ہندوستان آ کر بس گئے ہوں گے، اور یہ شاید موہنجو دڑو کے دور سے بھی پہلے کی بات ہے اور عملی نقطہ نظر سے ہم ان لوگوں کا ثانی ہندوستان کے اصلی باشندوں میں کر سکتے ہیں۔^۴

ہندوستان کے اصلی باشندے کون کس کو قرار دیتا ہے اور اس کی مدت آمد کیا شمار ہوتی ہے۔
ہندو اتا کے موجودہ نظریہ کے پس منظر میں یہ بات اہمیت کی حامل ہے۔ آریہ قوم جب تک ہندو ازام کے ساتھ آ کر بسی تب تک وہ ہندوستان کی اصل نسل کہلانی اور وہی آریہ قوم اگلے ہزار سال میں نئے مذہب کے ساتھ داخل ہونا شروع ہوئی تو وہ بدیسی تھہری ہے اور باہر کی اولاد قرار پاتی ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکالنا آسانی بات ہے کہ وجہ نزاع نسل و تہذیب و تمدن نہیں بلکہ مذہب ہے۔ نسل بھی ایک، تہذیب و تمدن بھی ایک، رنگ بھی ایک اور زبان بھی (اس وقت) ایک ہی تھی۔ مذہب بدلنا، تو یہ سب چیزیں مذہب کے تحت آ گئیں۔ یہ سلسلہ ابھی تک چل رہا ہے اور اکھڑہ رہنے کی سبیل ممکن نظر نہیں آ رہی ہے۔

آج کے دور میں اور آج کی زبان میں بات کریں تو ایران، کرداشتان، افغانستان، ترکستان، ازبکستان، کرغزستان، آذربائیجان، قازقستان، تاجکستان، وغیرہ ممالک جو وسط ایشیاء میں واقع ہیں، وہ علاقے ہیں، جہاں سے آریہ قوم نے ورود کیا ہے۔ وسط ایشیاء کے ان ممالک میں اس قوم کی مرکزیت ازبکستان کا علاقہ قرار دیا جاتا ہے۔ زندگی کی ضرورتوں اور آسائشوں اور موسمی خصیٰت کے حوالے سے یہ علاقہ آج بھی قابل رشک نہیں ہے۔ زندگی کے ذرائع کا تعلق اس وقت زمین اور حیوانات تک محدود تھا۔ اس لیے یہ لوگ معلومات ہونے پر دوسرے بہتر علاقوں میں ہجرت کر جاتے تھے یا قبائلی لڑائی کے نتیجے میں لوگوں کو ہجرت پر مجبور ہونا پڑتا تھا۔ ہجرت وہ عمل ہے جو رکا

ہے نہ رکے گا۔ انداز اور طریق کا رد لatarہا، مورخین کا اس بات پر اتفاق ہے۔ مسلم مورخ مسعودی نے قریب قریب ۱۱ صدیاں قبل اس بات کی صراحة کر دی تھی کہ یورپ اور ایشیاء میں ساری اقوام کی نسل ایک ہی ہے۔ زندہ روایت بھی تصدیق کرتی ہے کہ یہ لوگ اسی علاقے سے ایک طرف ہندوستان اور دوسری طرف یورپ کو نکل گئے اور بحیرہ کاسپین (Caspian) کے ساتھ چل کر کئی علاقوں میں آباد ہو گئے ایڈورڈ میر کے نزدیک یہ اندوآرین تھے۔ جو بیک وقت شمال مغربی ہند اور عراق کی طرف بڑھے۔ ویدک اتنے کے مطابق چودہ سو سال قبل مسح کے عہد میں ایران اور شمال مغربی ہند کے رہنے والوں کا مذہب اور تہذیب ایک تھی ٹول ڈیورنٹ کا موقف بھی یہی ہے۔ کہ بحیرہ Caspian کے علاقے سے آتے اور ان کے فارسی کزنوں (Cousins) نے آریاؤں کا گھر قرار دیا۔ اسی دوران Kassiites آریائی اور ویدک آریائی ہند میں داخل ہوئے۔ ۱۱

یہ بات تو بھی کے نزدیک مسلم ہے کہ ہجرت کئی لہروں میں ہوتی رہی ہے۔ مورخ بیڈن پاول کے مطابق آرین ایک ساتھ وارد نہیں ہوئے تھے۔ اس لیے جو قبائل بعد میں آئے، انہیں مقامی لوگوں کے علاوہ پہلے سے آئے ہوئے آرین قبیلوں سے بھی لڑنا پڑتا تھا۔ نو وار دز یادہ جو شیئے ہوتے تھے۔ اس لیے اکثر وہ غالب آتے اور پہلے سے موجود قبائل پیچھے ہٹ جاتے۔ اسی مورخ کے مطابق آرین شمال مغربی دروں کے ذریعے وادی سندھ میں داخل ہوئے۔ ۱۲

ہند کا قدیم ترین مذہب

ول ڈیورنٹ کے مطابق ہند کا قدیم ترین مذہب ناگا لوگوں کا تھا اور یہ مذہب آج بھی دور افتابی علاقوں میں موجود ہے۔ اس مذہب میں غاروں، پہاڑوں اور ستاروں پر بنے والی ارواح، درختوں اور ندیوں میں رہنے والے جانوروں کی پرستش کی جاتی تھی۔ سانپ اور ناگ ان کے دیوتا تھے۔ ۱۳ العجیب آریائی ویدک مذہب کے ساتھ داخل ہوئے اور اس وقت ویدک میں نہ مندرج تھے اور نہ مورتیاں، البتہ بتوں کے شواہد موجود ہیں۔ ۱۴

ہندو مت کی مختصر تاریخ

آرین قوم کے مذہب سے متعلق ان کی مذہبی کتب کو، ہی محور تحقیق بنایا گیا ہے۔ اسے ویدک

ادب بھی کہتے ہیں۔ رگ وید، سام وید، بیجروید اور اتھروید کے نام سے یہ کتابیں جانی جاتی ہیں۔ رگ وید مذہبی تفکر کی اولین دستاویز بھی جاتی ہے۔ ہروید کے پہلے حصے کو سمتحا دوسرے کو برہمن، تیرے کو آرینیکا، چوتھے کو اپنیشید کہا جاتا ہے۔ سمتحا میں آریائی دیوتاؤں کے لیے بھجن اور گیت، برہمن میں زیادہ تر مذہبی رسومات، آداب زندگی اور قربانی، آرینیکا میں روحانی خیالات کا تذکرہ اور اپنیشید میں مکمل فکر کا حادی ہو جانا ہے۔ پروفیسر ای. این ٹالبٹ (I.N.Talbot) نے وید کی اہمیت کے حوالے سے لکھا ہے کہ وید کی جہاں ایک مذہبی عقیدہ ہے، وہاں اُس نے قومی نشانہ ثانیہ کے عمل کو بھی آگے بڑھایا ہے۔ اس نے ہندو ازام کو مذہبی دائرے میں داخل کر کے اسے بین الاقوامی اہمیت دلائی ہے۔^{۱۵} ہندو مت میں وید کی ادب کو الہامی سمجھا جاتا ہے جبکہ بعد کی کتب ”رامائن“ اور ”مہا بھارت“ کو الہامی نہیں سمجھا جاتا۔ ”رامائن“ میں جنگوں کے حالات اور قصے کہانیاں شامل ہیں۔ یقیناً یہ اس دور کے لوگوں کی دنیا کا عکس ہوگا۔ ”مہا بھارت“ میں ایک جنگ کا تذکرہ ہے جو ہندوؤں کے نزدیک مقدس جنگ ہے ”بھگوت گتیا“ اسی کتاب کا ایک حصہ ہے۔ جومیدان جنگ میں کرشن کے پند و نصائح پر مشتمل ہے۔ محققین اس کو بھی قبل مسح کی کتاب قرار دیتے ہیں۔ ”بھگوت گتیا“ ہندو مت میں پہلے سے موجود کتابوں کی نسبت زیادہ بہتر انداز میں لکھی معلوم ہوتی ہے۔ وحدانیت، مادہ، روح، رہبانیت اور زندگی پر نقطہ نظر موجود ہے۔ پرانوں کا دور ہندو مت میں اس کے بعد شروع ہوتا ہے۔ پرانوں میں پانچ باتوں کی نشاندہی کی گئی ہے۔ یعنی ۱۔ تخلیق کا نتات، ۲۔ تاریخی ادوار کا بیان، ۳۔ دیوتاؤں یا رشیوں کا بیان، ۴۔ منو میت روں کا بیان اور، ۵۔ سورج بنی اور چندر بنی۔ پرانوں کا دور گویا برہمنی وید کی دور سے تری مورتی (برہما، وشنو، شیو) کا دور میں داخل ہو کر جدید ہندو مت بنتا ہے۔ جدید ہندو مت میں ویدوں کا تصور برائے نام رہ گیا ہے مگر بنیادی مأخذ اور عقیدہ کے وید ہندو مت کے ارتقاء کے ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ وید کی ادب الہامی کے علاوہ دھرم سورت ۲۰۰ سے ۱۰۰ قبل مسح کے دوران ویدوں سے ماخوذ اور دھرم شاستر یا اسمرتی (۱۰۰ قبل مسح سے ۵۰۰ عیسوی) سے ماخوذ فقہی ضابطے شامل ہیں۔ جبکہ آخر میں اتم تشتی (اطمینان قلب) شامل ہے۔ یہ فقہی ضابطے موجودہ ہندو مت کے سماجی وجود اور اُس کے نظام اور تقسیم، وبا قاعدہ اور جائز بناتے ہیں۔ جس میں ذات پات کا نظام سرفہrst ہے۔

شمائل و سلطی ایشیاء سے بھرت کرنے والے آرین جو ہندو مت کے مذہبی تفکر کے ساتھ آئے۔ اپنے آپ کو برتر طبقہ میں شمار کرتے ہوئے برہمن، کھشترا، اورو لیش کا درجہ دیا جبکہ مقامی

لوگ کمتر طبقہ یعنی شود رکھ لائے۔ پھر انسانی زندگی کو چار حصوں یعنی تعلیم و تربیت کا دور، گھر بانے کا دور، گھر سے لائقی کا دور اور تارک الدنیا ہو جانے کے دور میں تقسیم کیا۔ برصغیر برتر ذات ہے۔ لہذا اس کے ذمہ مذہبی و فکری سیادت ہے۔ کھشتہ ری دفاعی اور حفاظتی امور سرانجام دیتے ہیں جبکہ ولیش معیشت کے ذمہ دار ہیں اور شود رباتی تینوں کی خدمت کے ذمہ دار ہیں۔

ہندو مت کیا ہے؟ ہندویت کیا ہے؟ پنڈت جواہر لال نہرو کے افکار دلچسپی کا باعث ہیں۔

دور جدید میں گاندھی کے بعد بڑی شخصیات میں سے ایک ہے اور موجودہ بھارت اور کانگریس پر ان کا گہرا اثر رہا ہے۔ نہرو ہندویت کو مذہبی معنوں میں استعمال کرنے پر متعارض ہے۔ ان کے نزدیک یہ معروف معنوں میں مذہب نہیں ہے۔ بلکہ اس کا جذبہ زندہ رہا اور زندہ رہنے والے عکاس ہے اور گاندھی کی اس تعریف پر اتفاق کیا کہ اگر مجھ سے ہندو مت کی تعریف کرنے کو کہا جائے تو میں صرف اتنا کہوں گا کہ پر امن طریقوں سے حق کی جست کا دوسرا نام ہے۔ ہندو مت حق و صداقت کا مذہب ہے، حق ہمارا خدا ہے۔ ہمارے ہاں خدا سے انکار کی مثالیں موجود ہیں مگر حق سے انکار کی کوئی مثال نہیں۔^{۱۶}

ہندو کے لفظ کو تاریخی ادب کا حصہ شمار نہیں کرتے بلکہ مذہب کے لیے آریا دھرم کا لفظ استعمال ہوا ہے۔

پنڈت نہرو ہندو مت یا ہندو ازم کو مذہبی مضمون کے بجائے تہذیبی مضمون میں استعمال کرنے پر زور دیتے ہیں۔ جبکہ موجودہ ”ہندو اتا“ کا تصور ایک قومی تصور یعنی نیشنل ازم کو بنیاد بناتا ہے۔ ہندوستانی تہذیب کو ”ہندو اتا“ کے تحت بیان کرنا موجودہ لہر کا حصہ ہے۔ نہرو ہندوستانی تہذیب کے لیے لفظ ہندو مت کو محض اس کے وسیع تر تناظر میں استعمال کر کے مذہبی یا تہذیبی منافرتوں کو کم کرنے اور ہندوستان میں سب کی مشترکہ تہذیب کو ایک ہی تہذیب کے نام یا ہندوستانی تہذیب سے موسوم کر کے آگے بڑھنے پر زور دیتے ہیں۔ جس میں موجودہ تمام مذہب کے لوگ ایک جیسا جینے، رہنے اور آگے بڑھنے کا حق رکھتے ہوں۔ لیکن BJP کا موجودہ ”ہندو اتا“ کا تصور دوسری مذہبی اقلیتوں کو ختم ہونے یا ختم کرنے کی شرط پر ہندوستان میں رہنے کی اجازت دیتا ہے۔ نہرو کا تصور ہندو مت یا ہندوستانی تہذیب تمام مذہبی اقلیتوں کو بعض قبول کرتا ہے جبکہ ”ہندو اتا“ کا موجودہ تصور تمام مذہبی اقلیتوں کو الگ کرتا ہے۔ ہندو اتا کا موجودہ تصور دوسری مذہبی اقلیتوں کے تشخص کو باقی رکھنے پر آمادہ نہیں ہے۔

ہندوستان میں اصلاحی تحریکیں

ہندوستان میں دو طرح کی اصلاحی تحریکیں برپا ہوتی رہیں۔ ایک وہ جنہوں نے داخلی طور پر بعض عقائد اور رسوم و رواج کی اصلاح کی اور دوسری وہ جنہوں نے ہندوستان سے بغاوت کی اور ایک طرح سے نئے مذہب کی بنیاد رکھی۔ داخلی اصلاح میں معروف نام بارہویں صدی عیسوی تک شنکر اچاریہ، رامانج، انند تر تھے، اور بسا، چودھویں صدی عیسوی میں راماند اپنے معروف بارہ چیلوں کے ساتھ، اگلی صدیوں میں چے تنیہ، دیوسادھو، دھنا جات، رائے داس، دادودیال، بیر بھان، ملوک روں شامل ہیں جبکہ جدید دور میں مہاتما گاندھی کا نام سرفہرست ہے۔

ہندوستان سے بغاوت کے نتیجے میں تین نئے مذہب کی بنیاد پڑی۔ جین مت، جس کا بانی مہاویر تھا۔ بدھ مت۔ جس کا بانی بدھ تھا اور سکھ مذہب۔ جس کا بانی گورو نانک تھا۔ جین مت اور بدھ مت دونوں ہم عصر تھے اور قبل مسیح میں ان کا ظہور ہوا۔ بدھ کا انتقال ۵۲۳ قبل مسیح میں ہوا۔ جین مت اور بدھ مت کو دیدک ادب کے الہامی سند ہونے پر انکار ہے۔ دونوں مذہب اہنگ پر زور دیتے ہیں۔ جین مت سخت قسم کا اخلاقی نظام ہے۔ زندگی اور فکر کے راہبانہ پہلو پر زور دیتا ہے۔ ذات پات کے نظام پر تنقید کی مگر رواداری برتنے کی بنا پر زیادہ کامیابی حاصل نہ کی اور اب ایک ہندوستانی معاشرت کے حصے کے طور پر باقی ہے۔ بدھ مت اس سے مختلف تھا۔ پروہتوں کے اثر اور ذات پات کے نظام پر زبردست تنقید کی اور اپنے اندر سرے سے اس کو جگہ نہ دی۔ اوہام پرستی اور مجرموں کی سخت مخالفت کی۔ اخلاقیات پر زور دیا۔ ذات پات اور پروہتوں کے اثرات قبول نہ کرنے کا نتیجہ یہ نکلا کہ بدھ مت کو ہندوستان کے باہر ٹھکانا کرنا پڑا۔ بدھ مت کے پیروکاروں کو ہندوؤں نے زیادہ تر قتل کر دیا اور بہت تھوڑے جان بچا کر بھاگ نکلے۔ سکھ مت کا زمانہ زیادہ جدید زمانہ ہے۔ یہ ہندوستان اور اسلام کے لطفن سے نکلا ہے۔ ہندوستان کے ساتھ بقا کی جنگ جاری ہے۔ مسلمانوں کے خلاف ۱۹۴۷ء تک مذہبی منافر تزویوں پر رہی ہے مگر اسلام نے سکھ مت کو نہیں چھیڑا۔ خلاص سے قبل عیسائیت اور اسلام ہندوستانیوں کی زندگی میں خصوصاً اسلام نے نئی الہامی فرکو خوب ترقی دے دی تھی۔ اسلام کے اثرات بھی ہندوستان پر بہت گھرے مرتب ہوئے۔ پنڈت نہرو کے بقول ^{۱۸} بھیت مجموعی ہندوستان نے اثرات سے متاثر ضرور ہوا اور ہندوستان کا اسلام بھی دوسرے ممالک کے اسلام سے کچھ نہ کچھ مختلف ہو گیا۔ اسلام کے عقیدہ توحید نے ہندو مذہب پر اثر کیا اور

ہندوؤں کے وحدت الوجود کے عقیدہ نے ہندوستانی مسلمانوں پر اثر ڈالا۔ غالباً نہرو نے عقیدہ وحدت الوجود کا سرسری مطالعہ صرف ہندووازم کے تحت کیا ہے۔ اسلام کے حوالے سے اس نقطے نظر کی تاریخ کو مد نظر نہیں رکھا گیا۔^{۱۹} جدید تحریکوں میں برہما سماج (۱۸۲۸ء) دیوندرناٹھ ٹیگور کی اصلاحی کوششیں ۱۸۳۲ء (اور کیش ب چندر سین کا دور ۱۸۳۸ء-۱۸۹۳ء) شامل ہیں۔ رام موہن رائے کی موت کے بعد دیوندرناٹھ ٹیگور نے اس اصلاحی تحریک کو آگے بڑھایا اور لازم قرار دیا کہ برہما سماج کے ساتھ آنے کا مقصد یہ ہو گا کہ وہ بت پرستی سے باز رہے گا۔ اللہ کی محبت سے سرشار ہو کر اس کی عبادت کرے گا اور اس کے پسند کے کام کرے گا۔ چندر سین بھی برہما سماج کا معروف راہنماء ہے۔ جس نے برہما سماج کے پیغام کو آگے بڑھایا۔ برہما سماج نے مجموعی طور پر ہندو مت پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ خصوصاً بت پرستی کے خلاف ایک شعور پیدا کیا اور عقیدہ توحید کو سمجھنے کی دعوت دی اور کئی ظالمانہ رسماں کو ختم کرنے کی کوشش میں کامیاب ہو

جنوبی ہند میں برہما سماج کے مقابلے میں شمالی ہند میں مختلف روڈل ہوا۔ اور سورتی دیانندہ (۱۸۲۳ء-۱۸۸۳ء) نے ۱۸۷۵ء میں آریائی سماج کی بنیاد رکھی اور ہندو مت میں اصلاح پر زور دیا۔ یہ تبدیلی ویدوں کی نئی تشریع کی بنیاد پر رکھی گئی۔ بت پرستی، اور ذاتات پات اور سماجی ناصافی کو ویدوں کی تعلیمات کے خلاف ٹھہرا یا۔ "The Saffron Wave" کا مصنف لکھتا ہے کہ یہ تجدُّد پسند تحریک عیسائی اثرات اور تعلیمات کے علاوہ مسلمانوں کی طرف سے تعلیم، زبان اور سماجی زندگی پر اثرات کی شدید مخالف تھی۔ یہی مصنف اس کے اثرات کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ کئی عشروں بعد آریائی سماج کے تحت پیدا ہونے والی فضائے ہندو نیشنلٹ تنظیموں جن میں ہندو مہا سجھا اور آرالیس RSS (RSS) شامل ہیں، کو زبردست تقویت بخشی آئی۔ آریائی سماج کی مکمل تاریخ کے لیے لالہ چپت رائے کی کتاب "آریائی سماج کی تاریخ" کا مطالعہ مفید رہے گا۔

حوالہ

- ۱۔ "ہندو اتا"، بمقابلہ "اقبالستان" ایک فکری چینچ کا فکری راستہ اس تحریر کے مصنف کی سوچ ہے۔ البتہ "ہندو اتا" کس حد تک چینچ ہے اور بھارتی سیاست میں کس قدر منفی سیاسی تبدیلی واقع ہو رہی ہے۔ میری سوچ و فکر سے اتفاق نہ بھی ہو تو کہدیے ب نیز کے روزنامہ "ڈان" میں شائع ہونے والے مضمون

کامطالعہ اس ضمن میں مفید رہے گی۔

-۲ خوشونت نگہ End of India ص ۱۹

-۳ مسلمانوں کا قتل عام، بابری مسجد کا انہدام، عیسائی مشنریوں کا قتل عام جس نے مسلمانوں اور عیسائیوں کو خوف زدہ کر کے ایک دوسرے درجے کا شہری بنادیا گیا ہے۔

-۴ پروفیسر عزیز احمد نسل انسانی کی تاریخ (ترجمہ)، ص ۳۲

-۵ ذی، ذی کوتیمی، قدیم ہندوستان کی ثقافت و تہذیب

-۶ رشید اختر ندوی تاریخ ارض پاکستان، ص ۲۳۳

-۷ Will Durant: Story of Civilization جلد اول، ص ۱۸

-۸ رشید اختر ندوی، ص ۲۰۸

-۹ پنڈت جواہر لعل نہرو، تلاش ہند، ص ۸۱

-۱۰ رشید اختر ندوی، ص ۲۰۲-۲۱۸

-۱۱ ول ڈیورنٹ، ص ۲۰

-۱۲ رشید اختر ندوی، ص ۲۲۸

-۱۳ ول ڈیورنٹ، ص ۲۵

-۱۴ ایضاً، ص ۲۸

-۱۵ ای۔ این۔ ٹالبوٹ، انڈیا۔ پاکستان، ص ۳۲

-۱۶ پنڈت جواہر لعل نہرو، ص ۳۱۵

-۱۷ ایضاً، ص ۳۱۵

-۱۸ عقیدہ وحدت الوجود علم الكلام میں ایک گہرا اور فلسفیانہ موضوع ہے۔ مگر سادہ لفظوں میں یہ روحانی میدان سے تعلق رکھتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی ذات اور تخلیق کائنات اور موجودات کائنات کے تعلق کی نوعیت پر بحث کرتا ہے۔ ہر مذہب نے اس پر ایک نقطہ نظر وضع کر رکھا ہے۔ اسلام نے وحی الہی اور الہام کی روشنی میں اس پر ایک نقطہ نظر مرتب کیا ہوا ہے۔ اسلام ایک خدا کا پرچارک ہے اور ہندو مت کین خداوں کے تصور اور کئی دفعہ اس سے زیادہ اور پھر بتوں کا قائل ہے۔ اس لیے یہ کہنا درست نہ ہوگا کہ ہندوانہ عقیدہ وحدت الوجود کا کوئی ایسا مقام ہے کہ وہ اسلام کے عقیدہ وحدت پر اثر ڈال سکے۔ یہ اور بات ہے کہ مسلمانوں اور ہندوؤں کے صدیوں اکٹھے رہنے سے عمل کے بعض انداز میں یکسانیت نظر آئے اور یہ بات اچنچھے کی نہیں ہے۔

-۱۹ تھامن، ص ۷۳-۷۱

ہندوata کی تحریکی بنیادیں.....(۱۸۵۷ء کے بعد)

”ہم ہندو اس عزم کا برملا اظہار کرتے ہیں کہ ہم اپنی آزادی کی جدوجہد جاری رکھیں گے۔ ۱۸۵۷ء ہماری قومی عظمت کا یادگار دن ہے جب آبا و اجداد کا ورشہ ہمیں واپس ملا۔ حکمت عملی کے اعتبار سے ہمارے ذرائع اور طریق کا وقت فتوت تبدیل ہو سکتے ہیں۔ جیسے اس وقت ہماری آئینی اور پر امن جدوجہد جاری ہے۔ لیکن ہمارا نصب العین تبدیل نہیں ہو گا اور وہ سوار جیا (SWARAJYA) کا حصول اور ہندوستان کی مکمل آزادی ہے۔ ہم اس مقصد کے حاصل ہونے تک اپنی جدوجہد جاری رکھیں گے۔“ ۱

یہ قرار داد ۱۹۳۲ء کو پاکستان مخالف دن منانے کے موقع پر سارے ہندوستان میں جلسے اور جلوسوں میں پاس کی گئی۔ اس قرار داد سے ہندوؤں کے عزائم اور آن کے قومی نصب العین کا اندازہ ہوتا ہے۔ آگے بڑھنے سے پہلے یہ وضاحت مناسب معلوم ہوتی ہے کہ اعتراض یہ نہیں کہ ہندو قومی سطح پر ایسے کیوں سوچتا ہے؟ ہر قوم اپنی حیات و بقاء کے لیے سوچ و بچار اور انسانی سطح پر عمل کا حق رکھتی ہے۔ ہندو قوم کے عزم و افکار منظم ہونے اور انہیں احتیاط سے آگے بڑھانے کے عمل کی نشاندہی اور وضاحت اس لیے مقصود ہے کہ یہ سارے عزم اور نصب العین مسلم قوم کی تحلیل پر مشتمل ہے۔ ہندوata کا تحریکی دور ۱۸۵۷ء تا ۱۹۳۷ء کا ہے۔ پھر یہ کسی اور انداز سے آگے بڑھتا ہے اور وہ عملی دور ہے تحریکی دور میں مسلمانوں نے بہتر حکمت اختیار کی اور ہندوata کی تحریک کو ناکام بناتے ہوئے ”پاکستان“ حاصل کر لیا۔ اس کے بعد ہندوata کا ”بھارت“ کے قیام کی صورت میں عملی دور میں شامل ہوتا ہے۔ یہاں تجزیہ اور دعویٰ یہ ہے کہ ہندوata کے اس عملی دور یعنی ۱۹۴۷ء و ما بعد ہندوستان بھر کے مسلمان اپنی بقاء کے لیے کسی واضح، بخوبی اور متفقہ لائے عمل یا نصب العین کے حصول میں مستعد و با عمل نظر نہیں آ رہے ہیں۔ حصول پاکستان کو شائد آخری اور فیصلہ کرنے میں جن عمل سمجھ لیا گیا ہے۔ اور مزید آگے کچھ کرنے کی مسلمانوں کو کوئی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ اس خطرناک خط نہیں

نے ہندوستان سے مسلمانوں کے وجود کو مٹا دینے کی خواہش رکھنے والے ہندو عناصر کو حوصلہ عطا کیا ہے اور وہ ہندو اتنا کے خواب کی تکمیل کے لیے مزید سرگرم عمل ہو گئے۔ دو اقدامات کی کامیابی نے ”ہندو اتنا“ کے علمبرداروں کو خاصاً حوصلہ بخشنا ہے۔ ایک پاکستان کو دو حصوں میں بخرا کرنا اور دوسرا ایودھیا میں بابری مسجد کے انہدام کو خوف اور دہشت اور کامیابی کے طور پر استعمال کرنا ہے۔ ہندو اتنا کی فکری بنیادوں کو موجودہ عرصے میں مضبوط بنالیا ہے۔ ذیل میں اس کی مختصر رودادِ محض اس خاطر نہیں کہ موضوع کا تسلسل قائم رہے بلکہ یہ دعوت غور و فکر ہے، ان اہل علم و فکر کے لیے جو اپنی حیات و بقاء کے لیے غور و خوض کرتے ہیں اور آگے بڑھنے کی آرزو رکھتے ہیں۔

مگر ۱۸۵۷ء میں میرٹھ میں مقیم ہندوستان کی فوج نے بغاوت کر دی۔ بغاوت ایک افواہ کے ردِ عمل میں تھی جو بنیادی طور پر کسی برطانوی عمل سے متعلق تھا۔ یہ غیر منظم غدر، بغاوت، آزادی کی جنگ سے موسم تاریخ میں موجود ہے۔ پنڈت جواہر لال نہرو نے اسے جاگیرداروں کی کارستانی قرار دیا ہے۔ لیکن جونتاج پیدا ہوئے ہیں وہ جہاں ہندوستانیوں کے غیر منظم ہونے کی نشاندہی کرتے ہیں وہاں برطانوی حکومت کے مکمل تسلط قائم کرنے کی تصدیق کرتے ہیں۔ ہم واقعات سے تو اپنے حق میں کچھ تلاش کر سکتے ہیں لیکن نتاج میں ہمارے لیے کچھ نہیں ہے۔

پہلا نتیجہ تو یہ نکلا کہ صدیوں سے جاری اپنے وقت کی قانونی حکومت کا خاتمه کر دیا گیا اور انگریز قوم نے اپنی باقاعدہ قانونی حکومت قائم کر دی۔ یہ درست ہے کہ مغلیہ حکومت کا آخری فرمان روایغیر اختیار کے بطور ایک علامت کے وجود رکھتا تھا۔ مگر تاریخ و قانون اور قوموں کی زندگی اور عمل میں بعض اوقات اس طرح کی بے اختیار علامتوں کی بھی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ انگریز اس سے پوری طرح باخبر تھا کیونکہ اس علامتی سلطان کی موجودگی میں انگریز یہ جگہ نہیں لے سکتا تھا۔ تاریخ برعظیم کا یہ ایک بڑا ہم موز ہے۔ اس لیے اس پر کئی جہتوں سے تحقیق و تفتیش اور پر کھنے کا حق باقی رہنا چاہیے۔ افواہوں کی گرد کے پچھے انگریز کی تائید کی تتم گری کی چال کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے ورنہ پہلی ضرب میں مغلیہ سلطنت کی علامتی حیثیت کا خاتمه اور اس کے ساتھ خاکستر سے آخری چنگاریوں کی تلاش اور ان کو سامنے لا کر بجھاؤنے کا عمل تاریخ میں بے شمار سوالات جنم دیتا ہے۔ بغاوت میرٹھ میں ہوئی اسی افواہ کی بناء پر ہندوستان کے کئی علاقوں میں عوام نے بھی احتجاج کیا۔ افواہوں سے جو کچھ جنم لیتا ہے یقیناً وہ غیر منظم ہوتا ہے۔ لیکن خاکستر کی ان آخری چنگاریوں کو تو ایک منظم منصوبہ بندی سے ہوادے کر بجھایا اور ملیا میٹ کیا گیا۔ اس تتم گری کی جھلکیاں تو

ہندوستانی مصنفوں کے علاوہ انگریز مصنفوں نے بھی بیان کی ہیں۔ یہاں ایک وضع دار اور روادار شہرت رکھنے والے سیاسی مصنف کی تحریر کا ایک اقتباس ہی کافی معلوم ہوتا ہے۔

اس وقت کے گورنر جنرل نے برطانوی پارلیمنٹ کو خطوط میں لکھا کہ ان لوگوں کے علاوہ جو بغاوت کے مجرم ہیں، بوڑھے، عورتیں اور بچے بھی مارے جا رہے ہیں ان کو بالقصد پھانسی نہیں دی جاتی بلکہ جب پورے گاؤں میں آگ لگائی جاتی ہے تو وہ بھی جل جاتے ہیں یا اتفاقاً گولی سے ہلاک ہو جاتے ہیں..... آم کے درختوں سے سولی کا کام لیا جاتا ہے اور ہاتھیوں سے پھانسی کے تختے کا اور جو غریب اس وحشیانہ انصاف کا شکار ہوتے تھے ان کے جسم کو توڑ موز کے انگریزوں کے آٹھ کے ہند سے کی شکل میں رسیوں سے باندھ دیے جاتے تھے گویا یہ بھی کوئی تفریجی مشغلہ تھا۔

قائم شدہ عنوان کی مناسبت سے دیکھیں تو ۱۸۵۷ء کے یہ سارے واقعات مسلمانوں کو محدود و معنوں کے لیے اس موز پر اتنا کافی تھا کہ مسلمانوں کے اقتدار کا خاتمه ہو گیا ہے۔ یہاں سے توازن، توافق و موافقت میں یہ تحریک کئی جہتی رخ اختیار کر لیتی ہے اور لڑکھڑاتے مسلمان، لڑکھڑاتی مسلم کشتی کو سنپھالنے کی تگ و دو میں نظر آتے ہیں۔ مسلمانوں کے لیے یہ بڑا پر خطر دور تھا انگریز جہاں انہیں سیاسی اور معاشی لحاظ سے کچل رہا تھا وہاں ہندو ہندوواتا کی فکر و نصب العین کے تحت تہذیبی و سماجی میدان میں منصوبہ بندی کر رہا تھا۔ آئندہ سطور میں اس تہذیبی و سماجی منصوبہ بندی یا ہندوواتا کے نصب العین کی تحریکی سرگرمیوں کی مختصر رواداد ہے۔

”۱۸۵۷ء ہماری قومی عظمت کا یادگار دن ہے جب آباؤ اجداد کا ورشہ ہمیں واپس ملا“ یہ الفاظ ”ہندوواتا“ کے تصور اور نصب العین کی نشاندہی کے ساتھ اسے ماضی کی ہندووانہ فکری زنجیر سے بھی جوڑتے ہیں۔ ۱۸۵۷ء سے پہلے کے ہندووانہ فکری ارتقاء کی نوعیت فکری بنیادوں کی سی ہے جو جبلی طور پر قوموں کی رگوں میں موجود ہتی ہے اور موقع پا کر کھل کر سامنے آ جاتی ہے۔ ۱۸۵۷ء سے پہلے ہندوؤں کی انگریزوں کے خلاف مزاحمت کی مثالیں نہ ہونے کے برابر ہیں۔ لیکن ۱۸۵۷ء کے بعد ہندوؤں نے انگریزوں کے خلاف واضح طور پر مزاحمت کا آغاز کیا۔ ۱۸۸۵ء میں کانگرس کا قیام اس کی واضح مثال ہے جس میں ہندوواتا کے تصور کو قطعی طور پر مسلمانوں کے خلاف منظم کیا گیا۔

پروفیسر I.N.Talbot کے مطابق مسلمانوں کے خلاف نفرت بھرا لڑی پہلی بار گجراتی تحریروں میں نظر آتا ہے۔ NARMADASH ANKAR (۱۸۳۳-۱۸۴۶ء) اپنی تحریروں میں مسلمانوں کو لیبرے اور عزمیں لوٹنے والے کے الفاظ سے نوازتا تھا۔ اس کے بعد بنارس کے ایک بندی

زبان کے مصنف (BHARATENDU HARISCHANDRA) نے ۱۸۷۱ء میں مسلمانوں کے خلاف ایک نظم لکھی۔ جس میں مسلمانوں کے ہاتھوں ہندو عورتوں کی بے حرمتی اور ہندوؤں پر مظالم کی تصویریکشی کی گئی۔ مسلمانوں کو بابر کی اولاد قرار دے کر غیر ہندوستانی قرار دینے کی لہر پیدا کی گئی۔ ۱۸۷۳ء میں میلاد موسیٰ بن ہبیل نے قرار دیا کہ ہندو، ہی اس سرز میں کے قدیم باسی ہیں اور وہ ہزاروں سال سے یہاں اکثریت کے ساتھ رہ رہے ہیں یہ ملک غاصب مسلمانوں کا نہیں ہے صرف ہندو، ہی قانونی طور پر بھارت کے وارث ہیں۔ اس کے بعد DAYANANDA VIVEKANANDA کا نام آتا ہے۔ جنھیں I.N.Talbot جدید بھارتی قومیت کا بانی قرار دیتا ہے۔ ۴

معروف ترانہ جواب ”ہندو اتا“ کا ترانہ ہے، بھی اسی دور کی تخلیق ہے۔ وندے ماترم۔

Bankim (Salutation to the mother)، (Bande Matarm) (1838-۹۲) نے اسے اپنے تمام حلقوں میں مسلمانوں کے خلاف ایک تاریخی جدوجہد کے نشان کے طور پر متعارف کرایا۔ Bankim نے ۱۸۷۵ء میں اسے گانے کے طور پر سامنے لایا۔ پھر اس کی مقبولیت کے پیش نظر اپنے ناول Anandamath میں ایک نئے پیرائے میں قدرے تفصیلی انداز سے بیان کیا۔ گاناسنکرت سے شروع ہو کر بنگالی زبان میں آتا ہے اور پھر واپس سنکرت زبان پر اختتام پذیر ہوتا ہے۔ ۵

لیکن اس خاص فرقہ درانہ جذبے (ہندو اتا) سے ملک کرنے میں وینیاک دمودار سوارکر (Vinayak Demodar Savarkar) اور مادیو سادیش گوالکر (Madhav Sadashir Golwalker) کی تحریروں کا موثر عمل دخل ہے۔ ۶

ساوارکر کی اس ضمن میں دو معروف کتب ہیں۔ پہلی (Hindutua-Who is Hindutua) اور دوسری (Shivaji) ہے۔ ساوارکر نے ۱۹۰۳ء میں ایک خفیہ تنظیم Abhinav Bharat کی تشکیل کے ذریعے ہندوازم میں آگے بڑھنے کے فقدان کو ہندو اتا کی فکر سے پورا کرنے کی علمی و فکری کوششیں کیں۔ ساوارکرنے ۱۹۰۶ء تک برطانیہ میں تعلیم حاصل کی اور بقول تھامس بلوم ایک اطالوی (Giuseppe Mazzini) سے متاثر ہوا۔ ہندوازم اور ہندو اتا کو کل اور جز کارتہ دیتے ہوئے ساوارکر لکھتا ہے۔

ہندو اتا ایک لفظ ہی نہیں بلکہ ایک تاریخ ہے۔ یہ ہمارے لوگوں کی مذہبی اور روحانی تاریخ ہے جسے ایک اور لفظ ہندوازم کے ساتھ خلط ملٹ کر دیا گیا ہے۔ ہندوازم اس کا ایک جزو ہے۔ ۷

جبکہ ہندو ایک ہندو ذات کے تناظر میں زندگی کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کرتا ہے۔^۶
بقول پروفیسر آئی این نالبوٹ، ساوار کرنے ہندو قومیت کی بنیاد مذہبی تفکر پر نہیں آٹھائی بلکہ
ہندو وانہ تہذیبی اور تاریخی کرداریت پر رکھی۔ اور دوسری قوموں یعنی مسلمانوں اور عیسائیوں کے
اس ضمن میں کردار اور عمل کو بدیکی کہہ کر الگ کر دیا اور صرف ہندو ازام کوئی کا حقیقی وارث قرار دیتے
ہوئے اسے دیدک سنہری دور سے مسلک کیا۔ یوں وہ دوسری اقوام خصوصاً مسلمانوں کو اس سارے
تاریخی عمل سے غائب کرنے کے لیے غاصب قرار دیتا ہے۔^۷

تمامس بلوم ہنسن (Thomas Blom Hansen) ساوار کرنے کے تہذیبی قومیت کے تصور
کو اطالوی مفکر موزینی سے متاثر قرار دیتے ہوئے لکھتا ہے کہ ساوار کر قومیت کی تشکیل میں
علاقائیت کو ہر قوم کی قابل فخر بنیاد قرار دیتا ہے اور قومیت کے لفظ سے جذباتی وابستگی کو لازم قرار
دیتے ہوئے "ہندوستان" کے صدیوں پرانے نام کو اجاگر کرتا ہے۔ سنسکرت کو زبان کی بھجتی اور
متدرکھنے کے شعور کی بنیاد قرار دیتے ہوئے ہندی کو اس کا جدید روپ قرار دیتا ہے۔ جبکہ تہذیبی
کلیت کے فلسفہ و تصور کو اجاگر کرتے ہوئے ذات اور خون کو اس سے وابستہ کرتا ہے اور اس بناء پر
ذات کو پاک رکھنے کا باعث قرار دیتا ہے۔

ایک اور اہم نقطہ جو ساوار کرنے اٹھایا کہ ہندو وہ ہے جو ہندوستان کو مقدس سرزمیں سمجھتا ہے
اور عملی تعلق رکھتا ہے۔ وہ بدھ مت، جیمن مت، سکھ مت اور ہندو دھرم کو ہندو داں لیے شمار کرتا ہے کہ
یہ ہندوستان میں ہی اپنے مقدس مقامات رکھتے ہیں۔ جبکہ مسلمان اور عیسائی ہندو نہیں ہو سکتے
چونکہ ان کے مقدس مقامات ہندوستان سے باہر ہیں۔

تمامس بلمن نے ساوار کر کی اس خواہش کو جس میں وہ مسلمانوں اور عیسائیوں کو ہندو
ازم کے دائرے سے باہر رکھتا ہے، وہ ڈر اور خوف قرار دیا جو اسے مسلمانوں اور عیسائیوں سے
سیاسی اور تہذیبی برتری کی صورت میں پیش آ سکتا ہے۔

جہاں تک مسلمانوں کی علاقائی وابستگی کا تعلق ہے وہ دنیا میں ہر جگہ ہندی مسلمان کے
نام سے پکارے جاتے ہیں۔ مسلمانوں کے بڑے مقدس مقامات تو ہندوستان سے باہر ہیں
چونکہ اسلام کا آغاز ہندوستان سے نہیں ہوا تھا البتہ بے شمار درگاہیں ہندوستان کے کوئے
کوئے میں موجود ہیں جو صرف مسلمانوں کے لیے ہی نہیں بلکہ ہندوؤں کے لیے بھی باعث
عقیدت ہیں۔

ساوار کرنے اپنی دوسری کتاب *Shivaji* میں ڈارون کی سو شل تھیوری کی اصطلاح استعمال کر کے مسلمانوں اور دوسری اقلیتوں کو خبردار کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے۔

Men, groups and races {are} in the process of consolidation under the stern law of nature to get forged in to that larger existence on the war through struggle and sacrifice. Those alone who can stand this fierce ordeal will prove their fitness not only the moral but even the physical fitness that entitles races and types of survivors in this world.⁸

ڈارون کی سو شل تھیوری پر پوری دنیا خصوصاً یورپ میں بہت کچھ لکھا گیا۔ اتفاق اور اختلاف کرنے والوں کی ایک بڑی تعداد موجود ہے۔ یہ اصطلاح چونکہ ایک خاص علمی پس منظر رکھتی ہے اس لیے اس پس منظر میں دنیا بھر کے مفکر اپنے حیالات کے تناظر میں اسے بیان کرتے ہیں۔ جیسے ساوار کرنے یہ اصطلاح اور اس کی تعریف بیان کر کے واضح طور پر مسلمانوں اور دوسری اقلیتوں کو پیغام دیا تھا کہ باقی وہی بچے گا جس میں باقی رہنے کی قوت ہوگی۔ دوسرے لفظوں میں یہ متنے اور مٹانے کا پیغام تھا۔ کئی اور حوالے سے ڈارون کی تھیوری سے اختلاف ممکن ہو سکتا ہے اور ساوار کر کو بھی مطعون کیا جاسکتا ہے۔ مگر تاریخی تناظر میں خصوصاً ۱۸۵۱ء کے بعد بلاشبہ و شبہ ہندوستان میں صرف اور صرف مسلمان نشانے پر ہیں۔ انگریز اور ہندوؤں نے مسلمانوں کو *Survival of fittest* کے عمل میں سے گزارنے میں کوئی کسر باقی نہیں چھوڑی۔ قیام پاکستان دراصل ساوار کر کے اس چیلنج کا جواب تھا۔ سوال ان سطور میں بار بار یہی ابھرتا ہے کہ ”ہندو اتنا“ کا تصور قیام بھارت کے بعد پختہ تر ہوا ہے۔ مسلمانوں نے قیام پاکستان کے بعد باقی رہنے اور آگے بڑھنے (*Survival of fittest*) کا لائچے عمل نظر انداز کر رکھا ہے۔ قیام پاکستان کو واحد اور آخری مقصد قرار دے کر ہم ساوار کر اور گواکر جیسے مفکرین کے چیلنج کو نظر انداز کرنے کے مرتكب ہو رہے ہیں۔ قوموں کے لیے باقی رہنے اور آگے بڑھنے کے لیے ستانے کا وقت نہیں ہوتا۔ کیونکہ دشمن رعایت کبھی نہیں برتا۔

Hensen کا تجزیہ ہے کہ ساوار کر کے نزدیک ہندو قومیت کے خلاف صرف مسلمان، یہ ایک زبردست چیلنج ہیں کیونکہ مسلمانوں میں آگے بڑھنے کی اعتماد افزاء صلاحیت موجود ہے جو ہندوؤں میں نہیں ہے۔ ہنسن اور ساوار کر غالباً یہ بھول جاتے ہیں کہ مسلمانوں نے ایک ہزار سال تک ہندوستان پر حکومت کی ہے اور کسی دوسرے مذہب یا تہذیب کے لیے معاندانہ چیلنج کا سوال

کھڑا کیا ہوتا تو آج ہندوستان میں صرف اسلام ہوتا۔ اسلام ایسے چیلنج نہیں بنتا اس کا یہ انداز ہی نہیں۔ ہمیں کا یہ خیال بھی درست نہیں کہ ہندوؤں میں آگے بڑھنے کی صلاحیت کا فقدان ہے۔

مزاحمتی اور عسکری نقطہ نظر کے تحت جدید ہندو قومیت کے تصور کو مزید آگے بڑھانے میں مادیوسادیشو گواکر کا بھی بڑا عمل دخل ہے جس کی تحریر میں تہذیبی تقدس (Cultural Holyism) اور قومی تکھیتی و طاقت کے ساتھ جدیدیت کے ساتھ ہم آہنگی رکھنے کے موضوع پر مرکوز ہیں۔ گواکر

کا (RSS) Rashtriya Swayamsevak Sang کے ممتاز نظریہ سازوں میں شمار ہوتا ہے۔

RSS ۱۹۲۰ء کے بعد ایک مضبوط ہندو نیشنلٹ تنظیم شمار ہوتی ہے۔ گواکر بھی مغربی نظریہ قومیت سے متاثر نظر آتا ہے۔ لیکن وہ جرمی کے نازی ازم کی بھی تعریف کرتا ہے۔ جس کا رو جان یہ تھا کہ

یہاںی مذہب اور جرمن نسل کے علاوہ باقی کوئی نہیں بچے گا۔ مسلمانوں کے حوالے سے یہ بات ہندوستان کے تناظر میں ہندو مفکروں کو اچھی لگتی ہے۔ گواکر کی کتاب We, Our Nationhood

1939ء میں شائع ہوئی جبکہ اس کی دوسری کتاب کا نام defined Bunch of Thaughts ہے۔

گواکر نے جرمی کی نازی سوچ کی تعریف ضرور کی۔ مگر ”ہندو اتا“ کے لیے وہ نسلی فضیلت کو بنیاد بنانے کے بجائے تہذیبی فضیلت کو بنیاد بناتا ہے۔ لیکن نسل کو ہم مقام ضرور دیتا ہے۔ اس کے نزدیک تاریخ اور سنسکرت زبان کا نتیجہ ہندو قوم یعنی بھارت اور اس کی تہذیب ہے۔ آری نسل کے حوالے سے برعظیم کے ایک ہونے کا ذکر آتا ہے۔ سنسکرت زبان کی اہمیت کو اجاگر کرتے ہوئے اسے ہندو نسل کی روح اور مجسمہ قرار دیتا ہے۔

وہ قومیت کے لیے جغرافیائی، نسلی، مذہبی، تہذیبی اور زبان کی وحدت کو لازمی قرار دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ کاگمرس کے صرف علاقائی وحدت کے نظریہ قومیت کو غلط قرار دیتا ہے اور واضح طور پر کہتا ہے کہ مسلمان کبھی بھی اس دلیس کے باہی نہیں رہے۔ مشترکہ رہائش یا پیدائش اس بات کے لیے کافی نہیں ہیں کہ وفاداریاں، خصوصیات اور طرز زندگی ایک جیسا ہو۔ علاقائی تصور قومیت میں مسلمانوں کو اگر شامل کر لیا جائے تو ہندو ازام کا نظریہ قومیت مبہم اور جذبہ حب الوطنی کو کم کرنے کا باعث بنے گا۔^۹

حوالی

- ۱۔ ٹرانسفر آف پاور
- ۲۔ پنڈت جواہر لعل نہرو، تلاش ہند، ص ۳۴۰
- ۳۔ ای این ٹالبوٹ، پاکستان اور انڈیا، ص ۳۹
- ۴۔ Contesting Nation، ص ۱۷۳-۱۶۲
- ۵۔ سناوار کر اور گوانگر کی کتابوں تک براہ راست رسائی نہیں ہو سکی البتہ ان کی کتابوں سے استفادہ کر کے ہندوستان کا تحریک کرنے والے مبنی انگریز حقیقین کی کتابوں سے استفادہ کیا۔ اور انگریزی اقتباسات انہی کی کتابوں سے لیے ہیں۔
- ۶۔ تھامس بلوم، The Saffron Wave، ص ۷۷
- ۷۔ ای این ٹالبوٹ، ص ۳۹
- ۸۔ تھامس بلوم، ص ۷۹
- ۹۔ ای این ٹالبوٹ نے ص ۱۵۰ اور تھامس بلوم نے، ص ۸۰ پر یہ بحث کی ہے۔

ہندوата کی عملی بنیاد میں (۱۹۸۰ء و مابعد)

"ہندوата" کا سفر تاریخ مسلم مخالفت و دشمنی کے تحت ۱۸۵۷ء سے تحریکی میدان میں اور ۱۹۸۰ء کے عشرے سے زیادہ کھل کر عملی اقدامات کے داخلے میں داخل ہوتا ہے۔ یا زیادہ واضح لفظوں میں ہندوata فکر کے لوگ باقاعدہ بھارت کی باغ ڈور سنچلاتے ہیں۔ ہندوата کی بنیاد پر قومی فکر کا ارتقاء تو پچھلے صفحات میں بیان ہو چکا ہے۔ ۱۹۸۰ء تک ہزاروں فرقہ وارانہ اڑائیوں کے باوجود بھارت کا ریاستی چہرہ شہری حقوق کے معاملے میں ہندوؤں اور مسلمانوں سمیت تمام اقلیتوں کے لیے قانونی طور پر یہاں تھا۔ عمل پذیری ایک الگ عمل ہے جس میں اکثریت ہاتھ دکھاتی رہتی ہے۔ لیکن RSS، VHP اور Jana Saugh وغیرہ کی طویل جدوجہد سیاسی سطح پر BJP کی صورت میں کامیاب ہونا شروع ہوئی۔ ۱۹۸۰ء کے ایکشن میں گو خاطر خواہ کامیابی حاصل نہ ہو سکی لیکن اس کے بعد "ہندوata" قوتوں نے منظم انداز میں عوامی حلقوں میں داخل ہونا شروع کر دیا تھا۔

بابری مسجد کا گرانا

پہلے اقدام کے طور پر ہندوؤں کے سارے طبقات میں مسلمانوں کے ہاتھوں تاریخی نا انصافی کے واقعات کو مذہبی رنگ دے کر ان کے جذبات کو مسلمانوں کے خلاف ابھارنے کی حکمت عملی اختیار کی گئی۔ یہ کامیاب حکمت عملی تھی۔ اپریل ۱۹۸۲ء میں VHP نے ورلڈ ہندو کا نگر میتھرا (Mathura) وارناسی (Varanasi) اور آیودھیا (Ayodhya) شامل تھے۔ اس قرارداد کی بنیاد تین باتوں پر رکھی گئی۔

- راما جسمانی طور پر ایودھیا میں بابری مسجد کی جگہ پر ہی پیدا ہوا تھا۔

- قدیم ہندو مندر بالکل راما کی پیدائش والی جگہ پر کھڑا تھا۔

- بابر کے دور میں اس کے وزیر باتی نے مندر کو مسما کر کے مسجد بنادی تھی۔

اس اعلان کے بعد خصوصاً جنوبی ہند میں راما اور بابر، خدا اور انسان اور ہندو ازام اور اسلام کے درمیان ایک مزاحمتی اور نفرت انگیز کشمکش نے جنم لیا۔ اسی کشمکش سے وہ لہر پیدا کی گئی جس نے ہندوؤں کے جذبات کو خوب ابھارا اور یوں ایودھیا میں قائم یہ تاریخی مسجد ہزاروں ہندوؤں کے حملے کے نتیجے میں گردادی گئی۔ اس دوران ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان سارے ہندوستان میں کئی فرقہ دارانہ جھٹپٹیں بھی ہوئیں۔ اس مزاحمتی واقعہ میں کئی مسلمانوں نے اپنی جانیں بھی دیں یہ واقعہ ہندوؤں کے لیے مذہبی طور پر تاریخی فتح کا نشان بن گیا اور مسلمانوں کے لیے ان کے مثاد ہے کہ نعرے کو تقویت دینے کے لیے خوف اور دہشت کی علامت کے طور پر سامنے لایا گیا۔ دہشت اور خوف کے لیے زیادہ واقعات کی ضرورت نہیں ہوتی۔ بابری مسجد جیسا ایک ہی واقعہ کافی ہوتا ہے۔

امریتا باسو (Amrita Basu) نے ایک مضمون میں اسے اوپنجی ذات کے ہندوؤں کی سازش قرار دیا ہے۔ اس کے نزدیک BJP پر بڑی ذات کے ہندوؤں کا قبضہ ہے جنہوں نے ذات اور طبقات کی تقسیم سے توجہ ہٹانے کے لیے اور جھوٹی ذات کے ہندوؤں پر برتری رکھنے کے لیے عوامی رُخ کو مذہبی عقیدے کی طرف موڑ دیا۔

کانگریس کے خلاف مہم

BJP کی فرقہ دارانہ پالیسی میں زیادہ زور ۱۹۸۶ء میں ایل۔ کے ایڈوانی کے پارٹی صدارت سنبھالنے کے بعد شروع ہوا۔ BJP نے بنگلہ دیش اور پاکستان سے روزگار کے لیے بھارت آنے والوں کو مسلمانوں کی سازش اور مداخلت قرار دے کر لوگوں کو ان کے خلاف ابھارا اور ان باتوں کو کانگریس کے خلاف استعمال کرنا شروع کیا۔ ۱۹۸۹ء میں پریس میں ایک منظم منصوبہ بندی سے کانگریس کی پالیسیوں کو مسلمانوں اور دوسری اقلیتوں کے حق میں باور کرا کر اپنی پوزیشن کو بہتر بنایا۔ کانگریس کے خلاف مہم میں نمایاں الزامات میں جعلی سیکولر ازام کا پرچار، اقلیتوں کی ناز برداری، مسلمانوں کی حوصلہ افزائی اور بیرونی (مسلمانوں) کی مداخلت شامل ہے۔

جو لوٹی ۱۹۸۹ء میں RSS اور VHP کا رام جنم بھومی اور بابری مسجد کا مسئلہ BJP کا جماعتی موقف بن گیا اور اسے بھی کانگریس کی کمزوری سے معمول کیا گیا۔ دوسری طرف BJP کے اہم راہنماؤں کو RSS کی سفر لیکنی میں شامل کر کے رابطوں کو مزید مستحکم بنایا گیا۔

”ہندو اتا“، الیکشن کا سلوگن

۱۹۹۱ء کے الیکشن میں BJP نے ”ہندو اتا“، کو اپنا الیکشن مینی فیسٹو قرار دے کر مڈل کلاس کی حمایت حاصل کرنے کے لیے خوب زور لگایا۔ BJP نے اقرار کیا کہ ”ہندو اتا“، ہی وہ واحد ممکن راستہ ہے جس کے ذریعے ایک مضبوط، ترقی پذیر اور موثر بھارتی ریاست حاصل کر سکتے ہیں۔ رام کو قومی علامت قرار دے کر سیاست کا محور بنایا گیا۔ مذہبی جنونیت کو سیاسی مقاصد کے لیے اعلانیہ طور پر استعمال کیا گیا اور دعویٰ کیا گیا کہ صدیوں کی محرومی کے بعد ہندو آتماجاگ اٹھی ہے۔ اسلام کو دست پذیری، جارحانہ انداز، عدم برداشت اور ہندو تہذیب کے لیے زبردست خطرہ کے طور پر پیش کیا گیا۔ ۱۹۹۰ء میں Missionary's Manifesto A میں لکھا گیا کہ ہندو اور مسلم دو الگ الگ نظریاتی گروہ ہیں اور مسلمانوں کا اولین مقصد ہندوؤں کو مسلمان بنانا ہے۔ یہ جنگ نظریاتی جنگ ہے اور سوئے ہوئے ہندوؤں کو اس کا اندازہ کرنا چاہیے۔ جب تک ہندو بھی مسلمانوں کی مذہبی تبدیلی کے بارے میں نہیں سوچتے یہ یک طرفہ ٹریفک رہے گی۔ اس کے لیے ایک مضبوط ہندو تنظیم کی ضرورت ہے۔

انگریز مصنف Hensen ۱۹۸۰ء کے آخر اور ۱۹۹۰ء کے شروع میں ہونے والے تشدد کو اتفاقیہ قران نہیں دیتا۔ BJP نے SP-RSS-VHP اور دوسری مذہبی تشدد اور جنونیت کی حامل تنظیموں سے گھٹ جوڑ کر کے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان ایک مستقل قسم کی تشدد مزاحمت اور مخالفت کی فضاء پیدا کر دی ہے جو تاریخ میں پہلے دیکھنے میں نہیں آئی۔ Sang Parivar کے بارے میں لکھتا ہے کہ یہ آئے دن نئے نعرے، نئے فلسفے اور راستے تلاش کرتے ہیں جو ہندوؤں اور مسلمانوں کی شناخت کے حوالے سے نئی انجمن اور مخالفت پیدا کر دیتے ہیں۔ اس نے ۱۹۹۰ء اور ۱۹۹۲ء کے تشدد و علاقائی نہیں بلکہ ملکی سطح پر منظم کرنے کا الزام لگایا ہے۔

بھارتی مصنفین ایک نقطہ نظر

تین انگریز مصنفین کے تجزیے کے بعد بھارتی مصنفین اور دانشوروں کی "ہندوata" کے حوالے سے تحریروں کی نشاندہی مقصود ہے۔ یہ مصنفین و دانشور "ہندوata" کو بھارت کے مقاصد کے خلاف باور کرتے ہیں۔ معروف مصنف اور کالم نگار خوشونت سنگھ اور کلد یپ نیر "ہندوata" کا تنقیدی جائزہ لیتے ہیں۔ *The End Of India* جس کا اردو ترجمہ پاکستان میں آچکا ہے۔ خوشونت سنگھ نے ہندو قوم پرستی کا ایک جائزہ پیش کیا ہے کہ "ہندوata" فرکا آغاز برطانوی عہد ہی میں آریا سماج کے تحت پروان چڑھنا شروع ہو چکا تھا۔ جس کا بنی سوامی دیانند سرسوتی (۱۸۸۳ء-۱۸۲۳ء) تھا۔ ۱۸۸۶ء میں بنگالی نشادہ ثانیہ کے دوران ہندو میلیوں میں ہندو قوم پرستی نے جنم لیا جہاں ہندو نوجوانوں کو لڑنے کی تربیت دی جاتی تھی۔ آریا سماج نے ہندوؤں کے سنبھری دور کو واپس لانے اور مسلمانوں اور عیسائیوں کو دوبارہ ہندو بنانے کا تصور دیا۔ یہ مہم ۱۹۲۲ء میں ہندو مہا سبھا میں ڈھل گئی۔ جبکہ ۱۹۲۵ء میں RSS کیشو بلی رام ہجوار (۱۹۳۰ء-۱۹۸۹ء) میں ناگپور کے مقام پر قائم ہوئی جبکہ ۱۹۳۶ء میں ساوار کرنے ہندو قومیت کو ایک نظریے کی شکل دی۔ خوشونت سنگھ نے گواکر سے اپنی ملاقاتات کا تذکرہ کیا ہے اور تاثر دیا ہے کہ ان لوگوں نے "ہندوata" کا تصور حکمت عملی سے آگے بڑھایا ہے۔

کلد یپ نیر بھارت کا معروف سیاسی تجزیہ نگار ہے۔ اس نے متعدد مضامین اس ضمن میں تحریر کیے ہیں۔ پاکستان میں انگریزی روزنامہ "ڈان" میں باقاعدگی سے مضامین لکھتے ہیں اور "ہندوata" کو بھارت کے لیے خطرناک قرار دیتے ہیں۔ BJP کی پالیسیوں اور لیڈر شپ کا تجزیہ "ہندوata" کے تناظر میں کرتے ہوئے لکھا ہے۔

BJP کو نظریاتی غذا فراہم کرنے والے ایل۔ کے۔ ایڈوانی، مرلی منوہر جو شی اور نریندر مودی نے اس پارٹی کے اصل چہرے کو بے نقاب کرنے میں نمایاں کردار ادا کیا۔ ممکن ہے ان کا خیال ہو کہ اپنے دور حکومت میں ہندو قومیت کی مضبوط بنیادیں رکھ دی ہیں اور ممکن ہے کہ وہ یہ بھی خیال کرتے ہوں کہ انہوں نے ہندوستانی لوگوں کے بغیر کسی مذہبی تفریق کے مل جل کر رہے کی روایت کو تبدیل کر دیا ہو۔

ایل۔ کے۔ ایڈوانی کی رسمیات اور انتظامیہ کو فرقہ وارانہ نقطہ نظر سے سوچنے کا راستہ دیا۔

اس نے یہ خیال کیا کہ وہ RSS کے عزائم کو BJP کے تحت زیر حکومت ریاستوں میں تعینات گورنر، وزراء اور راجیا سبھا کے ذریعے بہتر طور پر آگے بڑھا سکتا ہے۔

مرلی منوہر جو شی دزیر تعلیم تھا اور اس نے RSS کی اس فکر کو نصاب تعلیم میں تبدیلی کر کے سمو دیا کہ مسلم حکمرانی کے بہترین دور میں ہندوؤں کو بری طرح دبایا گیا۔ اس نے بچوں کے ذہن کو انتہائی پر اگنده کر دیا۔

زریندر مودی نے BJP کے عزم کو آشکارا کرنے میں فیصلہ کن دھماکہ کیا۔ اس نے گجرات میں ریاستی منصوبہ بندی کے تحت ہزاروں مسلمانوں کا قتل کر کر مسلمانوں اور اقلیتوں کو طویل عرصے کے لیے عدم تحفظ سے دوچار کر دیا۔ اس طرح اس نے BJP کا اصلی چہرہ بھی نمایاں کر دیا اور واجپائی اور جسونت سنگھ جیسے لوگوں کے چہرے سے بھی نقاب اٹھا دیا جو قدرے آزاد خیال ہوتے تھے۔ مودی کے خلاف کارروائی نہ کرنا اس بات کی تصدیق ہے۔^۵

کلدیپ نیر نے ۳ ستمبر ۲۰۰۵ء کے ایک مضمون میں لکھا ہے کہ بھارت میں فرقہ وارانہ فسادات کی انکواڑی کے سلسلے میں کل ۲۸ کیشن بنے اور ہر ایک نے ان فسادات کے سلسلے میں پولیس کی اقلیتوں کے خلاف معاندانہ سرگرمیوں اور ہندو کی حمایت کو بنیادی وجہ قرار دیا ہے۔^۶

امریکی ریاست کیلیفورنیا نے "ہندو اتا" کے تاریخی تسلسل کو مسترد کر دیا۔ "ہندو اتا" کو تاریخی حقیقت باور کرنے کی خاطر ہندو بنیاد پرست بھارت سے باہر نکل کر میں الاقوامی سطح پر تاریخی حقائق کو مسخ کرنے کی کوششوں میں مصروف ہیں۔ اس کی تازہ ترین مثال امریکی ریاست کیلیفورنیا کے ریاستی تعلیمی بورڈ (SBE) (State Board of Education) نے ۸ مارچ ۲۰۰۶ء کے اجلاس میں تاریخ ہند کے حوالے سے نصاب تاریخ میں تجویز کردہ ساری ترا میم کو مسترد کر دیا۔

یہ ترا میم "ہندو اتا" کو ایک تاریخی نظریہ اور حقیقت باور کرانے کی خاطر ہندو اتا نظریے کو فروع دینے کی خاطر قائم ہونے والی دو تنظیموں نے تجویز کیا تھا۔ یہ دو تنظیمیں ویدک فاؤنڈیشن (Vedic Foundation) اور ہندو ایجوکیشن فاؤنڈیشن (Hindi Education Foundation) "VF"

"HEF" تھیں۔ ان ترا میم کو ہندو تاریخ کے مسخ کرنے کے ارادے کو روکنے کے لیے تقریباً ۱۰۰ جنوبی ایشیا اور تقریباً ۵۰ کے قریب امریکن اور دوسرے میں الاقوامی سکالرز اور پروفیسر حضرات نے بورڈ کو لکھا تھا۔ (Defeat for Hinduta Revisionists) کے عنوان کے مضمون مائیکل ویزل (Micheal Witzel) جو ہارڈ یونیورسٹی میں ساٹھ ایشیان سندیز کے پروفیسر ہیں، نے لکھا ہے۔

پاکستان سے اقبالستان تک

جس میں اس نے اس سارے قضیے کی تفصیل دی ہے۔ ”ہندوآتا“ کی غلط تاریخی حیثیت اور تعبیر کو تاریخی لحاظ سے غلط ثابت کرنے میں سکالرز کے علاوہ کئی تنظیموں نے بھی کام کیا جس میں نمایاں ترین دولت یعنی پنجی ذات کے ہندوؤں کی تنظیمیں تھیں۔ ان تنظیموں میں سے چندا یک کے نام یہ ہے۔

- Friends of South Asia (Fosa).
- Federation of Tamil Sangams of North America. "FETNA"
- Dalit Freedom Network (DFN)
- New Republic India (NRI)
- Dalit Sikh Temples (DST)

دولت تنظیموں نے (HEF) کی تجویز کردہ نکات سے دولت اور ذات کی تقسیم کے عنوان خارج کرنے پر احتجاج کیا اور دولت قوم کی بے تو قیری سے آگاہ کیا۔ یہ شودر قدیم ہندوستان میں نچلے طبقے کی حیثیت سے ڈاکٹر رام شرمن کی کتاب مطالعہ کے لیے مفید ہے گی۔ ۵

حوالہ

- | | |
|----|---|
| ۱- | ۵۵ ص Contesting Nation |
| ۲- | ۱۵۹_۱۶۱ ص، The Saffran Wave |
| ۳- | ۱۷۳_۱۸۰ ص، The Saffran Wave |
| ۴- | ۲۰۲_۲۰۷ ص، The Saffran Wave |
| ۵- | کلدیپ نیر، روزنامہ ”ڈان“ ۳ اگسٹ ۲۰۰۵ء |
| ۶- | کلدیپ نیر، روزنامہ ”ڈان“ ۳ ستمبر ۲۰۰۵ء |
| ۷- | روزنامہ ڈان، اسلام آباد ۲ اکتوبر ۲۰۰۶ء |
| ۸- | ڈاکٹر رام شرمن ”شودر“ اردو ترجمہ جمال محمد صدیقی لاہور۔ |

بر عظیم میں اسلام کی آمد۔ I

مسلمانوں کی تاریخی بنیادوں

نمہب اور عقیدہ انسان کے جبلی تقاضوں سے تعلق رکھتا ہے۔ اسے زیادہ جدید لفظوں میں فکر و شعور کا نام دیا جاسکتا ہے۔ یہ فکر و شعور سفرِ انسانیت کے ساتھ آگے بڑھ رہا ہے۔ انسانی ہجرت تاریخ میں سفر نہب و عقیدہ اور فکر و شعور کی ترویج و احیاء کا ذریعہ بنتی رہی ہے۔ یہی ذریعہ بر عظیم پاک و ہند میں اسلام کی آمد، قبولیت و مزاحمت اور ترقی کا باعث بنا۔ یہ داستانیں تاریخ کے اوراق پر موجود ہیں۔ ان سطور میں تفصیل یا تحقیق مقصد نہیں ہے بلکہ ایک طاریانہ جائزہ مقصود ہے۔

بر عظیم میں اسلام کی آمد کئی لہروں، کئی اطراف، کئی جہتوں اور کئی سمتوں سے ہوئی۔ اس کے دو انداز معروف رہے ہیں اور شاید زمانے کے بھی یہی انداز معروف تھے۔ ایک جنگجویانہ و فاتحانہ اور دوسرا صلح جو عالمانہ۔ صلح جو اور عالمانہ انداز کسی باقاعدہ منصوبہ بندی کے بغیر کئی دوسرے اسباب کے تحت خود رو تھا جبکہ جنگجویانہ اور فاتحانہ انداز کسی نہب و فخر کی ترویج و احیاء سے قطعی مختلف مقاصد کا مظہر رہا ہے۔ ہندوستان کے اندر تبلیغی مقاصد کے بغیر عربوں کا تجارتی سفر یا کئی دوسرے انداز سے آنا جانا تاریخ سے ثابت ہے۔ البتہ تاریخ اسلام کی آمد کے اس انداز کا بہت محدود تذکرہ کرتی ہے کیونکہ اس زمانے میں تاریخ کا سفر لوگوں یا معاشرے کے ساتھ وابستہ نہیں ہوتا تھا بلکہ بادشاہوں، حملہ آوروں اور لشکروں کے ساتھ ہوتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ کئی حکماء تاریخ کی تعمیر نو کی طرف توجہ دلاتے رہے ہیں۔

حمرانوں کے ذریعے

سندھ وہ دروازہ ہے جہاں اسلام ایک لشکر کے ساتھ داخل ہوا اور پھر بذریعہ پورے ہندوستان میں پھیلتا چلا گیا۔ ۱۸۵۷ء تک اسلام لشکروں، معروفوں، حمرانوں اور صوفیاء کے ذریعے آگے بڑھتا رہا۔ جنگوں اور قتال کے معرکے ہیں، فتوحات اور شکستوں کی داستانیں ہیں۔ پھیلاؤ اور سکڑنے کے قصے ہیں۔ انصاف اور ناصافی کے چرچے ہیں۔ جبر و قہر اور حرم و فرا خدمی کے دعوے ہیں۔ یہ کہانیاں ایک ہزار سال پر محیط ہیں۔ داستان گولی بھی ہو گئی اور سچائی بھی موجود ہے۔ مسلمان ایک عظیم اکثریت، ایک پُر عزم ارادے اور پورے ہندوستان میں اپنی ایک شناخت کے ساتھ موجود ہیں۔ یہ تاریخ میں سچائی کا ثبوت ہے۔

ہندوستان جدید تصور ریاست کے مطابق تو کبھی ایک متحده سلطنت نہیں رہی البتہ ایک طاقتور ریاست رہی ہے۔ مسلمان فوج کے ذریعے حملہ اور بھی ہوتے رہے۔ اور صوفیاء اور علماء کی جماعتیں بھی داخل ہوتی رہی ہیں۔ یہی کچھ تاریخ سے ثابت ہے۔ البتہ ”ہندو اتا“ کے موجودہ مفکر اس بات کو زیادہ اچھا ل کرنے کا بھار کر اپنے حق میں فضاء، ہموار کرتے رہیں ہیں کہ مسلمان افواج نے زبردستی مذہب تبدیل کرایا ہے۔ یہ ہندوستان کی تاریخ سے ثابت نہیں ہوتا البتہ سیاسی مقاصد کے لیے اسے اگر استعمال کیا جا رہا ہے تو یہ حکمت عملی کے اعتبار سے اور بات ہے ورنہ حکمران یا حملہ آور پہلے صرف حکمران یا حملہ آور ہوتے ہیں بعد میں شاید کچھ اور ہوتے ہوں گے۔ مسلمان حکمران یا حملہ آور بھی حمرانی اور فتوحات پر توجہ دیتے رہے ہیں۔ مذہب کی تبلیغ شاید کسی کا مقصد ہوا ہو۔ اس بات کی تصدیق خوشونت سنگھ اور کلدیپ نیر جیسے دانشور تسلیم کر چکے ہیں۔ البتہ اس طرح کی لشکر آوری میں موجود لوگ مقامی آبادی پر اپنے اثرات ضرور مرتب کرتے تھے۔ مسلم تاریخ حمرانی کے ایک ہزار سالہ دور میں اتنی بڑی اکثریت میں رہنا اور برعظیم میں مسلمانوں کی اکثریت کا نسلی تعلق و سط ایشیاء سے ثابت ہونا یہ ثابت کرتا ہے کہ مسلم حکمران نے مذہب کی جری تبدیلی کی کبھی حمایت نہیں کی اور ”ہندو اتا“ کے موجودہ مفکروں کا مسلم حمرانوں پر یہ الزام محض سیاسی مقاصد کے لیے ہے۔ تاریخ سے اس کی کوئی سچائی ثابت نہیں ہوتی۔ اس وقت مسئلہ حکمران کی حمرانی کو ہر لحاظ سے باقی رکھنا اور رعایا کو رعایا رکھنا تھا۔ مذہبی تعلق کو اولیت نہیں تھی۔ اس طرح کی تاریخ سے سچائی جانے کے لیے کئی بین الاقوامی معیارات قائم ہو چکے ہیں۔ انہیں بروئے کارلا

کر اور غیر جانبدار ماہرین تاریخ و آثار قدیمہ کی مدد سے اس تاریخی قصیے کو حل کیا جاسکتا ہے۔ تاکہ ایک ارب سے زائد بزرگیم کے انسان مذہب کی نفرتوں کو ہوادیئے والے لوگوں کے چنگل سے نکل سکیں۔ نفرت ماضی کا ایک بھرپور کردار رہا ہے۔ مگر محبت نے شکست کبھی نہیں کھائی اور آخری فتح بھی محبت کے حصے میں آنے والی ہے۔ نفرت، محبت کی حیثیت و عظمت کو اجاگر کرنے والی ضرور ہے۔ انسان کے شعوری ارتقاء کے اس موڑ پر بھی نفرتیں موجود ہیں لیکن انسان تلاش تو محبت ہی کی کر رہا ہے۔ بزرگیم کی تاریخ سے نفرتوں اور محبتوں کی تاریخ کو الگ الگ کر کے جانچا اور پرکھا جاسکتا ہے۔ نفرتوں کو دفن کرنے کی سبلیں نکالی جاسکتی ہیں۔ محبتوں کو پروان چڑھانے کی راہیں ڈھونڈی جاسکتی ہیں۔ بین الاقوامی معیار تحقیق و تفتیش کے مطابق دونوں مذاہب کے پیروکاروں یا حکمرانوں کی طرف سے زیادتی اور نفرتوں کے واقعات ثابت ہوتے ہیں تو انہیں پوری فراغدی سے آج کے مسلمانوں اور ہندوؤں کو تسلیم کرنے میں عام محسوس نہیں کرنی چاہیے۔ آج کے کسی مسلمان یا ہندو کو تاریخ کے اس طرح کے کسی تسلیم شدہ واقعہ کو اس دور کے تناظر میں دیکھنا ہوگا۔ آج کے زاویہ نگاہ سے تاریخ کے کسی واقعے کو سیاسی مقاصد یا قومی مقاصد کے لیے استعمال کرنے سے قومی تعمیر محبت کے بجائے نفرت پر استوار ہوگی جو مستقبل کے انسانوں کے لیے مناسب نہیں ہوگا۔

بزرگیم پاک و ہند میں باہر سے آنے والی نسل کا تعلق آریا قوم سے ہے۔ پہتاریخ سے ثابت ہے۔ آغاز میں یہ آمد ہندو مذہب کے پھیلاؤ کا باعث بنتی ہے اور پھر اسلام کی آمد بھی آریانی نسل سے یہاں مضبوط ہوتی ہے۔ آریانیل کتنی لہروں میں یہاں آئی، اسے تاریخ حتمی طور پر بیان نہیں کرتی۔ مسلمانوں کی آمد کا آغاز با قاعدہ طور پر ۱۱ء میں محمد بن قاسم کی قیادت میں سندھ میں ایک منظم مہم کے تحت داخل ہونے سے کیا جاتا ہے۔ سندھ کو خلافت اسلامیہ میں شامل کیا گیا تو اس کی ایک خاص حیثیت بن گئی۔ نئے انقلاب پرور افکار اسلامی اور نئے انداز کے نظام حکمرانی نے سندھ پر معاشرتی لحاظ سے گہرا اثر ڈال لیکن خود رواور بے قاعدہ اندازان عرب تاجروں کا تھا جو اہم بندرگاہوں پر بغرض تجارت رکتے اور مقامی آبادیوں میں شادیاں کر لیتے تھے۔ یہ تاجر عربوں اور مقامی حکمرانوں کے درمیان ایک واسطہ کی حیثیت رکھتے تھے۔ مقامی حکمران سرپرستی بھی کرتے تھے اور کبھی کبھار سختی بھی کرتے تھے۔

مسعودی جب ہندوستان آیا تو اس نے اپنے ہم مذہبوں کو عبادت میں آزاد پایا۔ جبکہ ابن جوفل نے سندھان، سیمور اور کھماٹ میں مساجد دیکھیں تھیں۔ شیخ اکرام کے مطابق سندھ میں تو محمد

بن قاسم کی آمد سے اسلام کا آغاز ہوتا ہے جبکہ باقی ہندوستان میں حجاج بن یوسف کے خوف سے ہاشمی خاندان کے بھاگ کر آنے والے افراد کے ذریعے سے آگئے بڑھا۔^۲

فتح سندھ کے پونصدی بعد تک عربوں کا اثر رہا۔ اس کے بعد مقامی طاقت ورلوگ کی حصول پر خود مختار حکمران ہو گئے۔ اس کے ساتھ مصر اور شام پر قابض اسما عیلی (قرامطی) خلفاء کے علاقوں سے لوگ محض تبلیغی مقاصد کے لیے سندھ میں داخل ہوئے جیسے پہلا داعی (۸۸۳ء ۲۷۰ھ) میں داخل ہوا۔ بعد میں ۷۹ء میں فاطمی حکمرانوں نے متان پر قبضہ کر لیا اور فاطمی سکھ جاری کر دیا۔ لیکن ان کا یہ اقتدار قریب قریب ۱۰۲۸ء کو سلطان محمود غزنوی کے ہاتھوں ختم ہوا اور پورا سندھ ایک ہی مکتب فکر کے تحت آگیا لیکن یہ بات واضح ہے کہ اس عرصے میں اسلام کی اشاعت کسی منظم منصوبہ بندی سے تعلق نہیں رکھتی تھی۔ شیخ اکرام نے ”آب کوثر“ میں لکھا کہ ”سندھ کی بیشتر آبادی کا تبدیل مذہب آہستہ آہستہ اور کئی تدریجی منزلوں سے گزرنے کے بعد ہوا۔^۳

اسلام عرب اور ایرانی تاجروں کا لنکا، جزائر مالدیو، ساحل گجرات، مالابار، مغرب (مدراس) اور بعض روایات کے مطابق چٹا گانگ وغیرہ ساحلوں پر تجارت کی غرض سے آنے والوں کے ذریعے آگئے بڑھا۔ سندھ کی صورت کے برعکس امیر ناصر الدین سلیمانی اور اس کا بیٹا سلطان محمود غزنوی (وفات ۱۰۳۰ء) نے غزنی سے شمالی ہندوستان پر لگاتار حملے کے اور فتوحات حاصل کیں۔ سلیمانی نے پشاور کے پاس جے پال اور محمود غزنوی نے اس کے بیٹے انند پال کو ایک کے قریب شکست دی۔ ان دونوں لڑائیوں میں ہندوستان کے راجاؤں نے مشترکہ طور پر غزنی کے مسلمان حکمرانوں کو روکنے کی پہلی بار منظم کوشش کی مگر کامیاب نہ ہوئے۔ البتہ دو صدیوں تک یہ سلسلہ لاہور تک رکارہا۔ اس کے بعد سلطان معز الدین عرف شہاب الدین غوری (۱۲۰۶ء) نے بارہویں صدی عیسوی کے آخر میں توجہ کی۔ غزنی، متان، اچہ اور لاہور پر قبضے کے بعد حاکم مقرر کیے۔ پھر پرتوہی راج کو دوسرے معز کے میں شکست سے دو چار کر کے دہلی اور اجمیر کو شامل کر لیا۔ غوری کا رویہ ہندوستان میں لوگوں سے مثالی تھا۔ ہندی زبان کے ساتھ پرتوہی راج کا نام اپنے سکوں پر کندہ کرایا۔ ہوکھروں کی بغاوت فرد کرنے کے بعد واپسی پر دریائے جہلم کے کنارے (موجودہ سوہاواہ کے قریب مزار موجود ہے) انہیں ایک اسماعیلی فدائی نے شہید کر دیا گیا۔^۴

غوری کی وفات کے بعد قطب الدین ایک کو ہندوستان کا پہلا بادشاہ غوری کے ترک افروں نے ۱۲۰۶ء میں منتخب کیا اور غوری کے غلام ہونے کے ناطے خاندان غلامی کی بنیاد رکھی۔ اتشن نے ۱۲۱۰ء میں اقتدار سنگھالا۔ اسے بھی خاندانی حکومت کے بجائے امراء نے منتخب کیا۔ اس کے دور میں منگولوں نے ایران اور عراق میں تباہی چاہی۔ اتشن کا دور اہمیت کا حامل رہا ہے۔ اس کی وفات کے بعد دس سال منظم حکومت نہ رہی البتہ اس کی ایک بیٹی رضیہ سلطانہ نے قدرے آزاد حکومت کی اور قرامطیوں کو دہلی پر قبضے سے روکا۔ ۱۲۳۶ء میں ناصر الدین محمود کو امراء نے بادشاہت کے لیے منتخب کیا۔ یہ شریف النفس اور صالح بادشاہ تھا۔ اختیارات زیادہ تر بلبن کو دے رکھے تھے۔ ۱۲۶۶ء میں اس کی وفات کے بعد یہی بلبن غیاث الدین کے نام سے تخت نشین ہوا۔ بلبن پہلے سخت گیر مگر بعد میں ایک مثالی بادشاہ بننے کی کوشش کرتا رہا۔ بلبن نے توسعی سلطنت کے بجائے استحکام سلطنت پر زور دیا۔ مگر اس کی وفات کے بعد اس کے بھتیجے کیقیاد خان اور اس کے باپ بغرا خان کے درمیان پائی جانے والی کشیدگی نے سلطنت میں انتشار پیدا کیے رکھا۔ اس لڑائی نے جلد ہی افغان نسل کے خاندان خلجی کے لیے موقع فراہم کیا۔ جلال الدین خلجی اس خاندان کا پہلا حکمران تھا۔ نہایت شریف اور خدا ترس تھا۔ اپنے عہد میں کسی کو قتل کرنے سے گھبرا تھا لیکن ایک ولی اللہ کا سری موالی کو قتل کرانے کی سازش میں ملوث ہو کر بر باد ہوا۔ اسکے بعد علاؤ الدین خلجی بادشاہ بنا۔ انتظامی لحاظ سے سخت تھا کیونکہ جلال الدین خلجی کی نرم روی انتظام سلطنت میں انتشار کا باعث بنی تھی۔ دشمنوں اور باغیوں کو کڑی سزا میں دیں۔ بلکہ مغل نو مسلموں کو قتل کرا کر ان کا نشان تک مٹا دیا۔ علاؤ الدین کے بعد اقتدار کمزور ہوا اور آخری سلطان قطب الدین مبارک شاہ امور مملکت میں ڈچپی کم لیتا تھا اور اختیارات ناصر خان خسرو کو دے رکھے تھے۔ جس نے بالآخر ۱۳۲۰ء میں اس خاندان کا نام و نشان تک مٹا دیا۔

۱۳۲۱ء سے تغلق، سادات اور لوہگی خاندان کا عہد حکومت مسلمانوں کے اقتدار کو ۱۵۲۶ء تک لے گیا۔

بابر جو تیمور کی اولاد میں سے تھا ۱۵۲۶ء میں پانی پت کے میدان میں لوہگیوں کو شکست دینے کے بعد شمال مغربی علاقے کا حکمران بنا۔ بابر کی وفات کے بعد ہمایوں بادشاہ بنا مگر شیر شاہ سوری نے ہمایوں کو شکست دے کر بھگا دیا۔ ہمایوں دوبارہ ایران کی حمایت سے ۱۵۵۵ء

میں واپس آیا۔ شیر شاہ سوری ۱۵۲۵ء میں فوت ہوا مگر ہمایوں بھی ۱۵۵۶ء میں فوت ہو گیا تو اکبر نو عمری میں حمران بنا اور سوریوں کو پانی پت کے میدان میں ہی شکست دے کر مضبوط حمران کی صورت اختیار کر لی۔ اکبر خود پڑھا لکھا نہیں تھا مگر اس نے ایک مشائی حکومت کی ہندو اکثریت کی اہمیت اور حیثیت کو پوری جگہ دی۔ جس پر مورخ دورائے رکھتے ہیں۔ مسلم مورخ اور بعض دوسرے مورخ اسے ہندوستان کا سب سے زیادہ روادار حمران خیال کرتے ہیں اور بعض مسلم مورخوں کے نزدیک اس کی مفہومتی پالیسی نے ہندوستان میں اسلام کی قوت کو کمزور کیا۔

اکبر کے عہد کا مطالعہ موجودہ ہندو مسلم کشمکش میں دیکھا جائے تو BJP کے سارے دعوے جھوٹے ثابت ہوتے ہیں۔ کسی حمران نے ہندوؤں کو زبردستی مذہب کی تبدیلی پر مجبور نہیں کیا۔ ملکی معاملات میں مناسب حد تک ہر حمران نے حصہ دیا۔ اکبر نے اسے زیادہ وسعت دینے کی کوشش کی۔ مسلم حکماء و علماء کو ہندوؤں کے امور سلطنت میں زیادہ دخل اندازی پر اختلاف نہیں تھے۔ انہیں اختلافات اس دین الہی کے مندرجات پر تھے جو اسلام کے بنیادی اصولوں سے مطابقت نہیں رکھتے تھے۔ اور انگریز عالمگیر کا نام ہندو مسلم کشمکش کے تناظر میں ایک مسلم انتہا پسند کے طور پر لیا جاتا ہے۔ مسلم انتہا پسند حلقہ اسے ایک صحیح مسلم بادشاہ کے طور پر پیش کرتا ہے جبکہ ایک حلقہ مسلم انتہا پسندی کے رویے کو ہندوؤں کے شخص کو دوبارہ منظم کرنے کی بنیاد قرار دیتا ہے۔ کیونکہ لظم حکومت میں ہندوؤں کا دخل کم کر دیا گیا تھا۔ اس کے علاوہ اور انگریز کا رویہ آخری عمر میں مزید سخت ہو گیا لیکن ہندوؤں کو زبردستی مسلمان کرنے کی کوئی روایت اس عہد میں بھی نہیں پائی جاتی۔ بعض لکھنے والوں نے چند مندرجوں کے مسماں کیے جانے اور اعلیٰ عہدوں کی پیش کش کو اسلام قبول کرنے سے مشروط کرنے کا ضمناً ذکر کیا ہے۔ جیسے این میری شمل نے ضمناً تذکرہ کیا ہے۔ مگر یہ بھی لکھا ہے کہ اس کا پورا عہد زندگی کی آسائشوں کے خلاف روزافزوں سختی سے متصف تھا۔^۵

یہ تذکرہ بھی کسی حکومتی منصوبے یا کسی جبرا کا پتہ نہیں دیتا جو خصوصاً ہندوؤں کو نشانہ بناتا ہو۔ جبرا جو اس دور کی تمام حکومتوں بشمل مسلم حکومتوں کا خاصہ تھا۔ وہ کسی مذہبی اقلیت یا اکثریت کے لیے خصوص نہیں ہوتا تھا بلکہ اقتدار کی را ہوں میں آنے والوں کو عبرت بنادینا پر انا اصول رہا ہے

اور آج کے دور میں بھی یہ اصول باقی ہے۔ اور انگریزیب عالمگیر کو ہی مثال کے طور پر لیجیے۔ اپنے باپ کے پیمار ہونے پر اس نے متوقع وارث اور اپنے بھائی دارا شکوہ اور اس کے بیٹے کو گرفتار کرنے کے بعد سزا نے موت دی۔ شاہ شجاع جو بنگال کا گورنر تھا اور مراد کو بھی موت کے گھاث اتنا را بلکہ اور انگریزیب نے مختلف وقتوں میں اپنے بیٹوں کو بھی جیل میں ڈاے رکھا۔ سواس طرح کی روایات شاید اس دور کا خاصہ تھیں۔

۷۰۷ء کو انگریزیب عالمگیر نے نصف صدی حکومت کرنے کے بعد وفات پائی۔ نصف صدی حکومت یہ بتانے کے لیے کافی ہے کہ کئی امور میں اس سے اختلاف رکھنے والے بھی ایک منظم حکومت شمار کرتے ہیں۔ منظم حکومت کا فیض عوام کے سب طبقوں کے لیے برابر و مناسب نہ ہوتا کسی شخصی حکومت کا نصف صدی حکمرانی کا عرصہ مکمل کرنا ممکن نہیں رہتا۔

۷۰۷ء سے ۱۸۵۷ء کا دور ہندوستان میں مغلیہ حکمرانوں کے زوال کا دور ہے اور یہی مسلم حکومت کے خاتمے کا دور بھی ہے۔ اور انگریزیب کا بیٹا معظم ۵ سال تک حکمران رہا۔ پھر یکے بعد دیگرے کئی حکمرانوں کے بعد ۱۹۷۱ء میں محمد شاہ رنجیلا تحت پر بیٹھا گواں نے طویل حکومت کی مگر اختیارات کم استعمال کیے۔ یہ شاعرانہ اور رومانوی مزاج کا حکمران تھا۔ اس کے دور میں خود مختاری کی تحریکوں کو موقع ملا۔ بنگال تو ۷۱ء میں ہی خود مختار ہو گیا تھا۔ ۳۸۔ ۳۹۔ ۱۸۵۷ء میں نادر شاہ نے تباہی مجاہدی۔ یہ مغلیہ حکومت کی پہلی نمایاں کمزوری تھی۔ اس کے بعد ۳۸۔ ۱۸۵۷ء میں احمد شاہ عبدالی نے پہلا اور ۷۵۔ ۱۸۵۷ء میں دوسرا حملہ کیا جبکہ اس دوران وہلی میں تخت پر قبضے کی کشمکش ہو رہی تھی۔ نادر شاہ اور احمد شاہ عبدالی کے حملوں نے مغلیہ حکومت کو کمزور کیا تو انگریزوں کا راستہ بنا جو بالآخر ۱۸۵۷ء میں مکمل طور پر ہندوستان پر قابض ہو گئے۔ انگریزوں کی بتدریج آمد اور قبضے کی تفصیلات کی ان سطور میں ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ بنیادی طور پر مسلم تاریخ پر طاریانہ نگاہ ڈال کر مسلم سفر کا عکس بیان کرنا مقصود تھا تاکہ ”ہندو اتا“ اور ”اسلام“ کے سفر کی رواداد سامنے رہے اور آگے کی بحث و نتائج کے لیے کے لیے سہولت میر ہو سکے۔

حوالہ

- ۱۔ اشتیاق قریشی، جدوجہد پاکستان، کراچی یونیورسٹی، ص ۷
- ۲۔ شیخ اکرم، آب کوثر، ص ۳۱
- ۳۔ ايضاً، ص ۳۵
- ۴۔ ايضاً، ص ۹۲
- ۵۔ این میری خمل، برصغیر میں اسلام، ترجمہ ارشد رازی، ص ۱۲۱

بر عظیم میں اسلام کی آمد-II

صلح جو اور عالمانہ طریقہ تبلیغ ہمیشہ موثر رہا ہے۔ یہ طریقہ زیادہ تراہل علم و فکر کو متاثر کرتا ہے اور یہی لوگ معاشرے پر زیادہ اور دیر پا اثرات مرتب کرتے ہیں۔ بر عظیم میں اسلام کی ترویج و احیاء میں کلیدی کردار پہلے دن سے روحانی بزرگوں کا نمایاں رہا ہے۔ اصطلاح عام میں انہیں ”صوفیاء“ کہا جاتا ہے۔ یہ طبقہ جاہ و حشمت کا متلاشی نہیں ہوتا۔ جو جاہ و حشمت کا طالب ہوتا ہے تو وہ روحانی بزرگ یا صوفی نہیں ہوتا۔ یہ اس طبقہ کی سادہ پہچان ہے۔ دوسرا اس طبقے کا مقصد انسان کو فیض پہنچانا ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انہیں اس سے غرض نہیں ہوتی کہ ان کے فیض یافتہ کس نہ ہب، کس قبیلے کس ذات، کس برادری، کس رنگ یا نسل اور کس صنف سے تعلق رکھتے ہیں نیز ان کا میدان ذات حقیقی سے تعلق و پہچان ہوتا ہے جو ہر انسان کی فطری ضرورت ہے۔ یہ لوگ انسان کو اس کے حصول کی آسان را ہوں پر ڈالتے ہیں۔

بر عظیم پاک و ہند میں اشاعت اسلام کا حقیقی کام ان روحانی بزرگوں کی محنت کا ثمر ہے۔ یہ کب آئے اور کیسے آئے؟ یہ ایک لمبی کہانی ہے، جس کا یہاں موقع نہیں۔ البتہ یہ درست ہے کہ مسلسل آتے رہے اور مسلسل اثرات مرتب کرتے رہے۔ ان کے اثرات کو کم کرنے کا ذمہ بھی اب ہمیں میں سے مسلمانوں نے لے رکھا ہے۔ کبھی تصوف کا تعلق ہم ویدانت تصوف سے جوڑتے ہیں اور کبھی اس کو عجم کے کھاتے میں ڈال کر غیر ضروری بلکہ بعض کے ہاں غیر اسلامی قرار دیتے ہیں۔ حالانکہ پغمبر اسلام ﷺ کا محور روئے سخن سارے انسان اور ساری دنیا ہے۔ عرب عجم کا سوال تعلیمات نبوی ﷺ سے تعلق نہیں رکھتا۔ یوں بھی کسی روحانی یا علمی ترقی کو حض کسی علاقائی مناسبت سے جوڑ کر اس کی افادیت کو کم کرنے کی کوشش کو احسن خیال نہیں کیا جاتا۔ زیر نظر

سطور کو اس حد تک محدود رکھنے کی کوشش کی جائے گی جس سے اس قدر عیاں ہو سکے کہ برعظیم میں اسلام کی آمد کا یہ بھی ایک اہم اور موثر ذریعہ رہا ہے۔ اس کا تعلق کسی حکمران سے نہیں رہا۔ ان لوگوں نے کسی سے زیادتی نہیں کی۔ خدا کی طرف بندے کو بلانے کا طریقہ جو لوگوں کو تکلیف نہ پہنچائے، اسے اختیار کیا۔ اپنے کردار کو انسانی نمونے پر ڈھالا۔ اپنی قوت نظری و عملی سے جس قدر فیضِ ممکن تھا، بلا تفریق رنگ و مذہب جاری رکھا۔

این میری شمل لکھتی ہیں:-

ہندوستانی اسلام کے تشكیلی دور میں بیشتر سیاسی تبدیلیاں صوفی رہنماؤں کے کردار کے مطالعہ کے پس منظر میں سمجھی جاسکتی ہیں۔ انہوں نے اسلام کے پھیلانے میں حکمرانوں اور سرکاری عاملوں کے مقابلے میں زیادہ کامیابی حاصل کی۔ ہمیں انہی کے تذکروں اور یادداشتوں میں ہندوستانی عوام کے طور طریقوں اور رسم و رواج کا پتہ چلتا ہے۔

تبیغ اسلام کا صلح جو اور انسان دوست طریقہ پہلے پہل سندھ کے راستے سے آیا۔ متان اور لاہور مراکزِ ٹھہرے۔ غزنی کے شیخ علی بن عثمان ہجوری المعروف داتا گنج بخش (۱۰۷۲ء) (متوفی ۳۶۵ھ) اولین صوفی بزرگوں میں سے ہیں جنہوں نے لاہور کو مسکن بنایا۔ لوگوں کی بڑی تعداد نے ان کے حلقة اثر میں اسلام قبول کیا۔ ”کشف الحجوب“ تصوف کی پہلی باقاعدہ تصنیف شمار کی جاتی ہے۔ گیارہویں صدی عیسوی میں جن دوسرے صوفی بزرگوں کے نام لاہور کی نسبت سے سامنے آتے ہیں، ان میں شیخ اسماعیل لاہوری، ابوحسن علی بن عمر بن حکم اور ابوالفتح عبد الصمد کا نام شامل ہے۔ جبکہ داتا گنج بخش کے بعد حسن صنعاوی (۶۵۰-۷۵۷ھ) سلطان بخاری سرور (متوفی ۱۱۶۱ء) خصوصاً ہندوستان کے حلقة ارادت میں شامل تھے، سید احمد توختہ ترمذی (متوفی ۶۰۲ھ)، سید یعقوب صدر دیوان زنجانی ترکستان (۶۰۱ھ)، عزیز الدین برکی (متوفی ۶۱۲ھ) اور سید مثلاً ہوری خوارزمی (متوفی ۱۷۷ھ) کا نام نمایاں ہے۔ کئی بزرگوں کے نام کا کسی حد تک ذکر ہے جب کہ کئی کا نام بھی مذکور نہیں ہے۔ لیکن یہاں سے ہی یہ لوگ رفتہ رفتہ ہندوستان میں پھیلتے رہے۔

سلسلہ سہروردیہ کو ہندوستان میں منظم کرنے والے شیخ بہا الدین زکریہ ممتازی ۶۶۵-۵۶۵ قریش مکہ کی شاخ ہبادی اسدی سے تعلق رکھنے والے بزرگ نے پہلے خوارزم اور پھر مستان میں سکونت اختیار کی۔ ان کے بیٹے شیخ صدر الدین (متوفی ۱۳۰۹ء) اور اس کے بعد شیخ رکن الدین

ابوالفتح جانشین مقرر ہوئے۔ ملتان میں آج کا مقام بھی صوفیاء کے حوابے سے شہرت رکھتا ہے جہاں قادری اور سہروردی سلسلے کا کردار رہا۔ سید جلال الدین بخاری، سید جلال الدین مخدوم جہانیاں اور ان کے بھائی سید راہوق تعالیٰ بہت معروف ہوئے۔ انتش کے دور میں قائم شیخ الاسلام کا عہدہ بھی سندھ میں بہاول الدین زکریا ملتانی کے پاس تھا۔ سندھ پر گھرے اثرات مرتب کرنے والے اہم ترین صوفی بزرگ مخدوم لال شہباز قلندر ۲۷۳۷ھ کا نام نمایاں ترین ہے۔ ان کا تعلق مرند افغانستان سے تھا اور آج بھی ان کا دربار مرجع خلاق ہے۔

سید معین الدین چشتی (۲۳۳-۵۳۶ھ) سیستان سے اجمیر شریف تشریف لائے۔ اور سلطان الہند اور غریب نواز کہلائے اور سلسلہ چشتیہ کے بانی کہلائے۔ اس دوران وہ بھی میں خواجہ قطب الدین بختیار کا کی (متوفی ۲۳۳ھ) نے ترکستان سے آکر خواجہ معین الدین اجمیری کے مرید خاص کے طور پر اثر قائم کیا۔ معین الدین اجمیری کے ایک اور مرید اور خلیفہ حمید الدین ناگوری (متوفی ۲۷۳۴ء) بخارا سے وہی آئے۔ ابتداء میں وہ ناگور ہے۔

معین الدین چشتی اور قطب الدین بختیار کا کی وفات کے بعد شیخ کبیر بابا فرید الدین شکر گنج (۲۶۶-۵۸۲ھ) موجودہ مزار پاک پتن ملتان جانشین بنے اور چشتیہ سلسلے کو صحیح معنوں میں منظم کیا۔ جنوبی پنجاب کے بڑے قبائل سیال، راجپوت اور وٹو آپ کے ہاتھ پر مسلمان ہوئے۔ چشتیہ سلسلہ کی اگلی دو شاخوں صابریہ اور نظامیہ کے بانی بابا فرید کے خلفاء تھے۔ علاوہ الدین صابر (۱۲۹۱ء)، سلطان المشائخ نظام الدین اولیاء، قطب جمال الدین ہانسوی اور امام الحق سیالکوٹی ایک خاص شہرت کے حامل ہیں۔ ان کے بعد بولی قلندر (متوفی ۱۳۲۳ء) کا نام بھی آتا ہے۔

جنوبی ہند میں سب سے پہلے جن بزرگوں کی آمد مشہور ہے وہ سید سلطان مظہروی (متوفی ۱۲۲۵ء) ہیں۔ ان کا سلسلہ نسب ممالک روم کے امراء سے جوڑا جاتا ہے انھوں نے ایران کے شہر ہرمز میں سید علی بادشاہ جو لوگ خلیفہ بابا ابراہیم کی بیعت کی۔ پھر حج بیت اللہ کے بعد اپنے قریباً ۹۰ سو رفقاء اور مریدین کے ہمراہ دکن تشریف لائے اور وہاں اشاعت اسلام کی۔ ان کا مزار ترچنا، بھلی میں آج بھی مسلمانوں اور ہندوؤں کے لیے مرجع خلاق ہے۔ آپ کے جانشین سید ابراہیم شہید (پیدائش ۱۱۶۲ء) اور بابا فخر الدین ثم سہروردی گزرے ہیں۔ سید عبدالقدار ولی ناگوری (متوفی ۱۵۷۰ء) خواجہ علاوہ الدین (متوفی ۱۵۵۵ء) بھی اسی علاقے میں گزرے ہیں۔ جبکہ چشتی سلسلے کے پہلے بزرگ شیخ منتخب الدین (متوفی ۱۷۰۹ھ) اس علاقے میں تشریف لائے۔ حضرت سید

بندہ نواز گیسوردراز (متوفی ۱۳۲۲ء) نے جنوبی ہند میں سب سے زیادہ شہرت حاصل کی۔

گجرات میں اشاعت اسلام مسلمان فاتحین سے پہلے ہی شروع ہو چکی تھی۔ آغاز ایک عبد اللہ نامی بوہرہ داعی یمنی سے ہوتا ہے۔ پٹن میں نظامی اور سہروردی سلطنت نے خاص شہرت حاصل کی۔ سلطان المشائخ کے خلفاء سید موسیٰ دراق الحسن و الحشمتی، مخدوم سید حسین خنگ سوار اور شیخ حسام الدین عثمانی (متوفی ۷۳۷ھ) کا نام معروف ہے۔ چراغ دہنی کی بھی پٹن پر توجہ رہی ہے۔ احمد آباد میں سہروردی سلسلے کا گہرہ اثر مرتب ہوا۔ مخدوم جہانیاں کے بھائی سید راجو قوال نے گجرات پر توجہ کی۔ آپ کے مرید سید محمد خدا بخش اور سید احمد مخدوم جہاں شاہ یہاں مدفون ہیں۔ دکن اور گجرات میں ان کا بھی کام ہے۔ دکن اور گجرات میں داول الملک المعروف داول شاہ (متوفی ۸۷۹ھ) حضرت شاہ عالم کے مرید تھے، کا نام احترام سے لیا جاتا ہے۔ گجرات میں بوہرہ جماعت کے پیر و کاروں کوئی عقائد کی طرف راغب کرنے کی خاطر کئی صوفیاء اور علماء نے ڈیرہ جمایا اور کامیاب بھی ہوئے۔ اس کے علاوہ میکن جماعت کے اسلام قبول کرنے سے گجرات پر گہرہ اثر ہوا۔ ان لوگوں نے اسلام سندھ میں قبول کیا مگر بعد میں گجرات اور سمندھ میں منتقل ہو گئے۔

ہندوستان کے ایک حصے بنگال میں شیخ جلال الدین تبریزی (متوفی ۶۳۲ھ) کا کام بہت گہرہ رہا ہے۔ ایرانی نسل سے تعلق رکھتے تھے۔ شیخ ابوسعید تبریزی کے بعد شہاب الدین سہروردی سے فیض حاصل کیا۔ شیخ بہاؤ الدین زکریا ملتانی کے ساتھ ہندوستان آئے۔ پھر دہلی میں خواجہ بختیار کاکی کے ساتھ رہے۔ شیخ فرید الدین عطار سے بھی متاثر تھے۔ آخری عرصہ بنگال میں تبلیغ اسلام میں گزرنا اور یہ علاقہ آج بھی ان کے اثرات تلے ہے۔ ان کے بعد شیخ سراج الدین عثمان (متوفی ۷۴۵ء)، شیخ علاء الحق بنگالی لاہوری (متوفی ۱۳۹۶ء)، ان کے بیٹے نور قطب الدین عالم (متوفی ۱۳۱۰ء)، شیخ جلال سلمہ (متوفی ۱۳۲۰ء) کا اشاعت اسلام میں بڑا کام ہے۔ غازی اولیاء بنگال میں ایک خصوصی نام ہے۔ ان بزرگوں کو باطنی اسرار و عبادات کے علاوہ عسکری مشقتوں سے بھی گزرنا پڑتا۔ ان میں اولین نام شیخ جلال کا ہے۔

جموں کشمیر بر عظیم پاک و ہند کا وہ خطہ ہے جہاں اسلام سب سے آخر یعنی چودھویں صدی عیسوی میں داخل ہوا۔ ۱۳۲۲ء میں کشمیر کے حاکم وقت رجن شاہ کو بلبل شاہ نے مسلمان کیا اور یوں اس کی رعایا بھی مسلمان ہوئی جبکہ اسلام کو کشمیر میں مستحکم کرنے والے بزرگ کا نام امیر کبیر سید علی ہمدانی (پیدائش ۱۳۱۲ء) ہے جو ایران سے ۱۳۶۹ء میں سات سو سیدوں کے ساتھ آ کر کشمیر

میں آباد ہوئے۔ آپ کی کئی تصانیف توجہ کے لائق ہیں۔

اشاعت اسلام میں ایک اور گروہ جو سندھ، ملتان، گجرات وغیرہ کے علاقوں میں ابھی تک اثرات رکھتا ہے وہ قرامطہ ہیں۔ جن کی نمائندگی دو اساعیلی فرقے بوہرہ جماعت اور آغا خانی جن کو خوب بھی کہتے ہیں، کرتے ہیں۔ ان کا فکری نسب مصر کے فاطمی خلفاء تھا ہے۔ فاطمی غایفہ مستنصر کے دو بیٹوں نزار اور مستعلی کے درمیاں جائشی کے جمحڑے کی بنا پر ہندوستان میں بھی ۱۰ گروہ ہوئے جو بالآخر موجودہ صورت تک پہنچے۔ مختصر ہونے کے باوجود ان کے اثرات اب بھی گھبرے ہیں۔ نور الدین نورست (متوفی ۱۲۲۴ھ) کے گروہ کے نام سے معروف ان کے پہلے داعی تھے۔ اس کے بعد شاوشش بزرداری (ولادت ۱۲۵۵ھ)، چھ صدر الدین (متوفی ۱۳۱۸ھ)، سید امام الدین (متوفی ۱۴۱۵ھ) جیسے مبلغین کا نام تھا ہے۔

بوہرہ جماعت کے داعی اول عبداللہ بخنی اور سیدی احمد شمار ہوتے ہیں۔ ۱۰۶۰ھ میں کھنڈت آئے اور گجرات کے راجہ کو مسلمان کیا۔ بوہرے زید و ترتوہندوستانی ہیں اور ہندوؤں سے مسلم ہوتے ہیں۔ لیکن یمنی نسل کا شاہزاد بھی بعض افراد پڑھتا ہے۔ جنہوں نے صدری عہد سے اس کے دو گروہ سیمانی اور داؤدی ہو گئے۔ داؤدی جماعت کے داعی اور راجہ جماعت کے داعی ہوتے ہیں جبکہ سیمانی گروہ کے داعی یمن میں ہیں۔

حوالی

- ۱۔ این، میری شمل، حصہ ۳۲
- ۲۔ اسلام کی اشاعت کے احوال میں شیخ اکرام کی "آب کوثر" اور این میری شمل، کو زیادہ بنیاد بنا یا ہے این میری شمل نے بھی شیخ اکرام ہی کو زیادہ بنیاد بنا یا ہے۔ اس ضمن میں پروفیسر عزیز احمد کی دو کتب بھی بڑی جامع ہیں۔ برصیغہ میں اسلامی جدیدیت اور بر صیغہ میں اسلامی کلچر انگریزی زبان سے دونوں کا ترجمہ ڈاکٹر جمیل جالبی نے خوبصورت انداز میں کیا ہے۔
- ۳۔ این میری شمل، حصہ ۲۰۸

مسلم سیاسی اقتدار کا خاتمہ اور نئی سیاسی کشمکش

بلائیک و شہر ۷ آگسٹ ۱۸۵۷ء برعظیم پاک و ہند کی تاریخ کا ایک سنگ میل بن گیا۔ تین قویں، تین مقاصد کے ساتھ میدان سیاست میں کھلم کھلا آئے سامنے آ گئیں۔

جن سے قوت و اقتدار جاتا رہا، وہ مسلمان تھے۔ اکثریت میں نہ تھے۔

جنہوں نے قوت و اقتدار مسلمانوں سے چھینا، وہ یورپ سے آئے ہوئے انگریز تھے۔ عیسائی تھے مگر یہاں ان کو عیسائیت کی بہت معمولی حمایت حاصل تھی۔

تیسرا قوت ہندوؤں کی تھی۔ اکثریت آبادی تھی۔ ہندوؤں کے لیے یہ صرف مسلمان حکمرانوں کی جگہ انگریز حکمران کی تبدیلی نہ تھا بلکہ کئی وجہ اس سے زیادہ اہم اور خوش آئند تھا۔

جن سے قوت و اقتدار جاتا رہا، وہ مسلمان تھے۔ ایک ہزار سالہ سیاسی اقتدار کے وارث ۷ آگسٹ سے قدرے قبل اور بعد ازاں ایک بے بس اور عبرت بن کر تاریخ مسلم کے سیاہ ترین باب کا اضافہ کر رہے تھے۔ جبکہ برعظیم کا مورخ نئی تاریخ کی ابواب بندی کر رہا تھا۔ یہ عظیم الشان سلطنت یک دم زمین بوس نہیں ہوئی تھی۔ اس کے زوال پر مسلم وغیر مسلم مورخین نے بہت لکھا۔ یہاں تفصیل کا موقع نہیں ہے۔

ہندوؤں نے قوت اور اقتدار مسلمانوں سے چھینا، وہ انگریز تھے۔ عیسائی مذہب سے تعلق کھتے تھے۔ پروفیسر عزیز احمد کے بقول ۱۸۵۵ء میں اس حکومت کے مقاصد کو پورا کرنے کے لیے قادری۔ ایڈمنڈ نے حکومتی ملازمین کو ایک گستاخی مراسلہ بھیجا جس میں یہ تجویز رکھی گئی کہ اب ہندوستان برطانیہ کے زیر حکومت ہے اور ذرائع نقل و حمل سے باہم

مربوط ہے اس لیے مناسب یہ ہے کہ اس کا مذہب بھی ایک ہو یعنی مسیحی۔

حکومت نے بعد ازاں اس کی تردید کی اور لائقی کا اعلان ضرور کیا مگر بات صحنه کے لیے اشارہ کافی تھا۔

تیسرا قوت یعنی ہندو، جو پہلے بھی رعایا تھی اور اب بھی رعایا تھی۔ حکمران بدلتے تو ان کی سوچ بھی بدلتی شروع ہوئی۔ انگریزوں سے تعادن میں مسلمانوں سے آگے نکل گئے اور اپنی اکثریت کی بناء پر اپنے عزائم کو سیاسی اظہار بیان کے ذریعے آگے بڑھانا شروع کیا۔ جسے بعد ازاں ۱۹۳۲ء کی قرارداد میں واضح کیا۔

۱۸۵۷ء بغاوت تھی، غدر تھا، جنگ آزادی تھی یا مسلمانوں کے زوال کی تکمیل کا آخری مرحلہ تھا؟ این میری شمل لکھتی ہے۔

۱۸۵۹ء میں ہندوستان کی صورت حال انگریزوں کے مکمل کنٹرول میں آچکی تھی۔ بظاہر کہیں بے چینی نظر نہیں آتی تھی۔ بہادر شاہ ظفر درگا ہوں پر حاضری دیتا اور پیر بن کر مریدین سے بیعت لیتا۔ شاعری بھی کرتا تھا۔ حالات سے مکمل سمجھوتہ کر چکا تھا۔ غالباً یہ عشرہ ہندوستان کے افق پر مستقبل کے طوفانوں کی نوک پنک درست کر رہا تھا۔ اچانک فروری ۱۸۵۷ء میں میرٹھ میں فوجی دستوں نے ایک افواہ کی بنیاد پر بغاوت کر دی اور یہ بغاوت فوج کے علاوہ کئی دوسرے علاقوں میں بھی پھیل گئی۔

محسوس ہوتا ہے کہ یہ مسلمانوں کے زوال کی تکمیل کا آخری اعلان تھا۔ افواہ کس نے پھیلائی، تاریخ میں اس کا کوئی جواب موجود ہے نہ اس کا جواب تلاش کرنے کی جستجو کی گئی۔ یہ ۹/۱۱ کے موجودہ واقعہ جیسا تھا۔ ورلڈ ٹریڈ سنٹر سے مسلمانوں کی محبت اور نفرت کی کوئی خاص بنیاد نظر نہیں آتی۔ مگر سارے کاسارالمبہ مسلمانوں پر گرا کران کی نسل کشی کی جا رہی ہے۔ برسوں میں جو طاقت پیدا کی تھی۔ اسے اگلے پچاس سالوں کے لیے پھر کچل دیا گیا ہے اور پھر اسے تہذیبوں کا تصادم قرار دیا جا رہا ہے۔ ۱۸۵۷ء کا یہ واقعہ بھی کچھ ایسے ہی مقاصد سے آلوودہ نظر آتا ہے۔ مسلمانوں کے اندر سے بھی کچھ قوت کو آخری جوش دے کر باہر نکالا گیا اور پھر اسے بری طرح کچلا گیا۔ ہندو فوجیوں اور عوام کے بعض حصوں نے بھی بھر پور شرکت کی۔ یہ بغاوت بھی بھی ملک گیر نہ تھی مگر انگریزوں نے ملکی آبادی کو پوری طرح دہشت زدہ کرنے کے لیے جو طریقہ اختیار کیا وہ

چنگیزی طریقے سے بھی بدتر تھا۔ دلی میں قتل عام اور اس طرح کی برابریت دوسرے علاقوں میں کئی ہفتوں تک روکھی تھی۔ اس برابریت کو پنڈت جواہر لال نہرو نے بیان کیا ہے:-
 جماعتیں شہروں میں دورہ کر رہی تھیں اور اتنا جلا دوں کی بھی کوئی کمی نہ تھی..... آم کے درختوں سے سولی کا کام لیا جاتا تھا اور ہاتھیوں سے چانسی کے تنخے کا اور جو غریب اس وحشیانہ انصاف کا شکار ہوتے تھے، ان کے جسم کو توڑ مردوز کے انگریزی کے آٹھ کے ہندسے کی شکل میں رسیوں سے باندھ دیتے تھے۔ گویا یہ بھی کوئی تفریحی مشغله تھا۔

حوالی

۱۔ این میری شمل، ص ۲۰۸

۲۔ پنڈت نہرو، تلاش ہند، ص ۳۲۰

مسلمانوں کی زندگی میں فیصلہ کن تبدیلی

تبدیلی بتدربی عمل میں آتی ہے۔ انگریزوں نے بھی بتدربی ہندوستان پر قبضہ کیا۔ ۱۸۵۷ء کے واقعات نے برطانیہ کو فیصلہ کن فوقيت دلائی۔ اسی وجہ سے پچھلی سطور میں ۱۸۵۷ء کے واقعہ کے پس منظر میں کسی نادیدہ قوت کی منصوبہ بندی کی طرف اشارہ کیا ہے۔ ۱۸۵۷ء سے پہلے بڑا عمل ۱۸۳۵ء میں فارسی کی جگہ انگریزی کو سرکاری زبان قرار دینا تھا۔ اس ایک عمل سے مسلمان کامل طور پر سیاست و حکومت کے ایوانوں سے بے دخل ہو گئے Hodgson نے اسے ان الفاظ میں بیان کیا ہے:-

But when the British decided to eliminate persian in favour of English it become evident that British rule—which for Hindus was mostly merely a change of masters. For Muslims meant a deposition from the postion of ruling class.¹

دوسری بڑی تبدیلی معاشرت کے میدان میں آئی۔ سیاسی قوت کے ختم ہو جانے کے بعد مسلمان معاشی لحاظ سے کمزور ہونے لگے۔ اس تبدیلی میں بحیثیت کل ہندوستان میں برطانیہ کی طرف سے ابتدائی قسم کی صنعتی مشینوں کو روشناس کرانا تھا جس سے پرانا زرعی نظام ٹوٹ گیا، شخصی ملکیت اور زمینداری کے تصورات تبدیل ہو گئے، معاشی نظام کی بنیاد زر پر رکھ دی گئی اور زمین قابل فروخت جنس بن گئی۔ رسم و رواج نے جو بندھن باندھ رکھے تھے، انہیں زرنے کھول کر رکھ دیا۔²

تیسرا اہم تبدیلی یہ ہوئی کہ انگریزی اقتدار ایسٹ انڈیا کمپنی سے لے کر براہ راست تاج برطانیہ کے ماتحت کر دیا گیا اور گورنر جنرل کے بجائے وائسرائے کی نامزدگی کا آغاز ہوا۔ ہندوستان کا فیصلہ کن طور پر ماضی سے تعلق منقطع کر دیا گیا۔ یہ گویا نیا ہندوستان تھا۔ پرانے سارے کردار نئی پوزیشنوں پر چلے گئے۔ مسلمان ریاست و اقتدار سے مکمل بے دخل کر دیئے گئے جبکہ ۱۸۵۷ء سے قبل براۓ نام ہی، اقتدار مسلمانوں کے ساتھ وابستہ تھا۔ انگریز جو پہلے ایک کمپنی

کے ذریعے حکومت کرتا تھا، اب تاج برطانیہ نے براہ راست ہندوستان کو اپنی مفتوحہ کالوں میں شامل کر لیا جبکہ ہندو مسلمانوں کے اقتدار سے گو خلاصی پر خوش ہو کر انگریزوں کے زیر اثر اقتدار میں انہی کی فکر اکثریت کی بنابرائے کردار کی ادائیگی کے لیے سوچ و بچار میں مصروف ہو گئے۔

گویا ہندوستان کا سیاسی، معاشری، معاشرتی اور تہذیبی منظر مکمل طور پر بد لئے گا اور اس پورے منظر میں خسارے میں جانے والے صرف مسلمان تھے۔ انیسویں صدی کا نصف آخر مسلمانوں کو دباؤ نے اور فنا کرنے کا دور ہے اور اسی دور میں مسلمانوں نے اپنے مستقبل کے حوالے سے بالکل نئے انداز میں سوچ و بچار شروع کی۔

این میری شمل نے اس کی نقشہ گری کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ۱۸۵۷ کی ناکام فوجی بغاوت ہندوستانی مسلمانوں کی تاریخ کا اہم موزب بن گئی۔ مسلمان پچھلی ایک صدی کی نسبت پہلے سے زیادہ اپنے شخص کی تلاش میں تھے۔ انگریزوں کے مکمل تسلط نے مسلمانوں میں ان ”کافروں“ سے ایک حد تک عدم تعاون اور ایک خاص حد تک طرز زندگی اختیار کر لینے کا رویہ پیدا کیا اگر ۱۸۵۷ء نے صورت حال تبدیل کر دی۔

این میری شمل نے ہی ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر کے حوالے سے لکھا ہے کہ:-

جن تبدیلوں کو ہندو خوش دلی سے قبول کر لیتے ہیں، مسلمان گناہ خیال کرتے ہیں۔

اس صورت حال کی نقشہ گری کئی جھتوں سے ممکن ہے اور کئی لکھنے والوں نے اپنے اپنے زاویہ نگاہ سے اس کی منظر کشی کی ہے۔ ۱۸۵۷ء کے بعد مسلمانوں کی تاریخ بدل گئی اور اس کے ساتھ مسلمانوں کی سوچ و فکر کے انداز بھی تبدیل ہونے لگے۔

۱۸۵۷ء کے واقعہ کے ساتھ ہی مسلمانوں کا اقتدار ختم ہو گیا۔

اقتدار انگریز نے چھینا اور مسلمانوں کو سابق حکمران طبقے کی حیثیت سے عکری، سیاسی اور معاشری لحاظ سے کچل ڈالا۔

اکثریت اور اقلیت کے فلسفے کو ہوادے کر مستقبل کے حوالے سے مسلمانوں کو خوف زدہ کر دیا۔

ان حالات میں مسلمانوں کی رہنمائی میں سر سید احمد خان اور ان کے بعد علامہ محمد اقبال کا نام آتا ہے۔ سر سید احمد خان (۱۸۹۸-۱۸۱۷) نے نازک وقت میں مسلمانوں کو باقی رہنے اور آگے بڑھنے کے سوالیہ نشان کے ساتھ اپنی سوچ و فکر سے رہنمائی دی۔ سر سید احمد خان کے بعض افکار سے تب بھی اتفاق نہیں کیا گیا اور اب ان افکار کی کوئی اہمیت بھی باقی نہیں رہی۔ لیکن جوبات

افکار سے اتفاق یا اختلاف سے بڑی اور اہم تھی، وہ یہ تھی کہ مسلمانوں کو اس گردا ب سے باہر نکلا جائے اور زندگی کو زندہ کیا جائے۔ مسلم قوم کا الیہ یہ ہے کہ اسے زوال سے نکلنے کا مسلم تاریخ میں پہلے سے تجربہ نہ تھا۔ یہ اختیاری فریضہ سقوط بغداد کے مسلمانوں کو عمومی اور غلامی ہندوستان کے بعد ہندوستان کے مسلمانوں کو خصوصی طور پر انجام دینا تھا۔ ہندوستان کے مسلمانوں نے بہر حال یہ چیز قبول کیا۔ سر سید احمد خان نے ۱۸۵۷ء کے الیہ کے فوری بعد کے حالات میں مسلمانوں کو مایوسی سے نکالنے میں اہم کردار ادا کیا۔ پروفیسر عزیز احمد نے ان کی اس تحریک فکر عمل کو تین حصوں میں بیان کیا ہے۔ ۱۸۵۹ء سے ۱۸۷۰ء تک سر سید احمد خان کی توجہ سیاسی استحکام کی طرف تھی۔ مسلمانوں کو غصہ کرنے اور نئے اقتدار کی بے جا مخالفت سے روکنا اور انگریزوں کو ان کی دبانے کی پالیسی کے ہولناک نتائج سے آگاہ کرنا تھا۔ گویا انگریزوں اور مسلمانوں کے درمیان تباہی کم کرنے کی پالیسی تھی۔ دوسرے مرحلے ۱۸۷۰ء تا ۱۸۸۳ء اتحاد بین الاسلامی کی تحریک کو خطرناک سیاسی مہم جوئی قرار دے کر ہندوستان کے مسلمانوں کو باز رہنے کی تلقین کی جبکہ تیسرا مرحلہ پر ۱۸۸۷ء تا ۱۸۹۸ء مسلمانوں کو سیاسی سطح پر الگ سے سیاسی سوچ اور اپنے وجود کی حقیقت کو باور کرانے پر مرکوز رکھی۔^۵

حوالی

- M.G.G Hodgson, The Venture of Islam (Vol-3) ۱-
- ۲- پنڈت نہرو، تلاش ہند، ص ۳۰۶
 - ۳- این میری شمل، ص ۲۱۰
 - ۴- این میری شمل، ص ۲۱۳
 - ۵- پروفیسر عزیز احمد، بر صغیر میں اسلامی جدیدیت، ص ۶۲

مایوسی کے اسباب۔۔۔ تاریخی، خارجی، داخلی

بارة طویل صدیوں تک اسلام ہندوستان میں ہندو مت کے ساتھ ساتھ رہا۔ بارہ صدیوں تک دونوں قومیں ایک دوسرے کے مدع مقابل رہیں..... عقائد کی تفریق کے علاوہ ایک جانب قومیت اولوالعزمیاں (ہندو ایسا) اور دوسری جانب قومیت تحفظ کے فطری جذبے کی آویزش، اکثر و بیشتر چپقلشوں اور تنازعوں کا سبب بنتی رہی اور آج تک جاری ہے۔

تاریخ کے بعض واقعات اور حادثات وقت اور تاریخ کے دھارے بدلتے ہیں، یہ واقعات و حادثات مایوسی کا سبب بھی بنتے ہیں مگر جو منہنے کے لیے تیار نہ ہوں، انہیں مایوسی سے نکلنے کے لیے راستہ بھی بتاتے ہیں۔ ہوشمند اور زندہ رہنے والی اقوام اگر ان واقعات و حادثات کو جانچ کر اپنی تازہ سمت اور حکمت عملی طے نہیں کرتیں تو پھر ان واقعات اور حادثات کے دھوئیں میں ڈوب کر گم ہو جاتی ہیں۔ ہند کی تاریخ میں خصوصاً مسلمانوں کے حوالے سے ۱۸۵۷ء ایک ایسا واقعہ تھا جو ایک نئی سمت اور حکمت عملی کا تقاضا کرتا تھا۔ اقبال کی فکر ۱۸۵۷ء کے بعد برپا ہونے والے واقعات اور اثرات کا جواب تھا جس کا پہلا نتیجہ پاکستان ہے۔ واقعات ہمیں تازہ سمت اور تازہ حکمت عملی پر مجبور کر رہے ہیں۔ انہیں تاریخی، داخلی اور خارجی سطح پر بیان کیا جاسکتا ہے۔

تاریخی کشمکش (جدید دور میں)

مسلم تہذیب اور ہندو تہذیب میں ایک تضاد، مزاحمت اور نکرا اور تاریخ کا طویل باب ہے۔ اتحاد اور اتفاق کی کوششوں کی جہاں ایک تاریخ موجود ہے وہاں تضادات و اختلافات بلکہ نکرا اور مزاحمت کی بھی ایک بھرپور تاریخ ہے۔ انسان ابھی شعوری لحاظ سے کمال پر نہیں پہنچا، جہاں وہ سچائی اور انسان دوستی کی معراج پا کر عمرانی نقطہ نگاہ سے دوسرے

لوگوں کے ساتھ اکٹھے رہنے میں رکاوٹ محسوس نہ کرے۔ لگتا ہے انسان کا سفر ارتقاء حیوانی سطح سے تو بہت بلند ہو چکا ہے مگر شعوری سطح پر پہنچنے کے لیے اسے ابھی وقت لگے گا۔ اس کی مثال ہندوستان میں ہندو مسلم حوالے سے تو موجود ہے مگر یہ اور دوسری کنی تہذیبوں میں تصادم تیری دنیا کے اکثر خطوط میں برپا ہے۔ ۱۹۱۱ کا واقعہ اور اس کا رد عمل عیسائیت و یہودیت اور طاقت و رامبریکہ و یورپ کی طرف سے وحشیانہ عمل یہ باور کراتا ہے کہ ابھی کچھ نہیں بدلا۔ مذہبی منافقت، تہذیبی برتری و فوقيت کے ارادے، سیاسی و معاشی استھان کے حریبے بھی تو پوری طرح نگئے ہوئے ہیں۔ مائل ڈبز کی رائے کے عین مطابق انہوں نے عمل کیا ”کہ جو اپنا نہیں ہے، وہ قابل نفرت ہے۔“ بوسنیا، افغانستان، عراق اور فلسطین میں مسلمانوں کو جس طرح ذبح کیا گیا ہے اور کیا جا رہا ہے ایسے ہی تو تاریخوں میں موجود و محفوظ ہے بلکہ قریب ترین کی تاریخ میں بھی موجود ہے کہ کوئی غیر مذہب، وحشی، درندہ صفت، انسان کش جاہل قوم اٹھی اور انسانوں کی بستیوں کو تاراج کرتے ہوئے ہر شان مٹا دیا۔ امریکہ اور یورپ کا کردار تاریخ میں اس کردار سے قطعی مختلف نہیں ہے۔ امریکہ، برطانیہ اور اسرائیل سے مستعار فکر اور اسلام کے ساتھ بھارت مسلمانوں سے اسی طرح بننے کی تیاری کر رہا ہے۔ بس یہی سوال ہماری توجہ کا مرکز رہنا چاہیے کہ ہم نے یعنی مسلمانوں نے مٹا نہیں ہے کیونکہ قرآن کی راہنمائی میں انسان کو ابھی مقام شعوری کی وہ چوٹی سر کرنی ہے جہاں عمرانی نقطہ نگاہ سے انسان دوسرے انسان کے ساتھ بلا تفریق مذہب، رنگ، نسل، علاقہ، زبان اور تہذیب کے اکٹھے رہ سکیں گے۔ یہ بات بڑی اہم معلوم ہوتی ہے کہ مسلمان ماضی میں بھی اور حال میں بھی وہ واحد قوم ہے جو ہر ملک، ہر معاشرے، ہر مذہب کے پیروکاروں - ہر رنگ - ہر نسل، ہر علاقے، ہر زبان اور ہر تہذیب کے رہنے والوں کے ساتھ عمرانی طور اکٹھے رہنے میں وقت محسوس نہیں کرتے۔ مسلمان اپنے طور طریقوں سے دنیا کے ہر کونے میں رہتے ہیں۔ ہر معاشرے اور ریاست کا حصہ ہیں۔ ہر تہذیب کا حصہ ہیں۔ ہر رنگ، ہر نسل اور ہر زبان سے مسلک ہیں۔ یہی وصف انہیں دوسروں کے ساتھ رہنے میں رکاوٹ نہیں بننے دیتا جو چیز مسلمانوں کے خلاف جا رہی ہے وہ ان کا عمرانی نقطہ نگاہ سے رہنا نہیں بلکہ ان کا وہ پیغام ہے جو لوگوں کو مذہب، رنگ، نسل، علاقے، زبان اور تہذیب سے اوپر اکساتا ہے۔ سب مسلمان قرآن کو پوری طرح سے نہیں سمجھتے مگر سب کا یہ عقیدہ اٹھ لے کہ قرآن بہت ہی بلند مقام کا حامل ہے۔ سب سے اہم بات کہ قرآن موجودہ یا سابقہ کسی

مذہب کی بطور مذہب نہیں کرتا بلکہ صرف یہ باور کرتا تا ہے کہ مذہب کے ایڈیشن میں سب سے تازہ پیغام خداوندی قرآن حکیم ہے۔

خارجی عوامل

دوسرابڑا تازہ واقعہ اگست ۲۰۰۱ء کے بعد امریکی عمل ہے۔ ولادثڑیڈ سنٹر پر حملہ کس کا منصوبہ تھا، کس نے کیا؟ وقت جوں جوں آگے بڑھتا ہے، لوگوں کو اس سے دچپی نہیں رہی۔ دچپی اس بات سے متعلق ابھرتی جا رہی ہے جو امریکہ آئے دن کیے جا رہا ہے۔ واقعہ ستمبر کے واقعات اور عمل پر دنیا بھر میں لکھا جا رہا ہے اور تقریباً لفظوں کے ہیر پھیر سے سمجھی متفق ہیں کہ امریکہ اور یورپ کی عیسائی و یہودی دنیا نے مسلمانوں کو نشانے پر رکھ لیا ہے۔ افغانستان پر جمہوریت اور انسانیت کے علمبردار انسانوں کی طرف سے افغانستان کے انسانوں پر غیر انسانی سطح پر بمباری اور سلوک، عراق میں بمباری و سلوک اور اس کے نتیجے میں انسانوں کی ہلاکتیں کوئی معنی اس لیے نہیں رکھتیں کہ وہ مسلمان تھے اور کالی جلد والے تھے۔ امریکی صدر نے صلیبی جنگ کا عندیہ اپنی ابتدائی تقریروں میں دے کر اس بات کو واضح کر دیا تھا اور جیسا کہ نام میگزین ۱۲ مئی ۲۰۰۳ء میں مائل ایلیٹ نے تسلیم کیا کہ جابرانہ سلط یاد و سرے لفظوں میں ایکپر یلزم نسلی برتری کے تصور کو جنم دیتا ہے۔ جیسے بريطانوی اب تک اپنے آپ کو ایک برتر قوم سمجھتے ہیں۔ اور اس کی مثال اس نے ایک کالے کھلاڑی کے لیور پول (Liver Pool) انگلینڈ کی طرف سے فٹ بال کھلنے پر دی جب تماشا یوں نے خوشی کا اظہار کیا اور اس پر کیلے پھینکے اور بندر کی آوازیں نکال کر داد دی اور یہ واقعہ اس کے نزدیک ۱۹۵۰ء کا نہیں بلکہ ۱۹۸۷ء کا ہے۔ اگست ۲۰۰۱ء کے پس منظر کا جائزہ اسی لکھنے والے نے ۱۵ اکتوبر ۲۰۰۱ء کے نام میگزین میں لیا ہے۔ اس مضمون میں اسی جائزے پر اکتفا کرنا پسند کروں گا۔ مائل ایلیٹ نے سات وجوہات کا ذکر کیا ہے۔ جن کا تدارک مقصد تھا اور یہ ساری مسلم دنیا سے تعلق رکھتی ہیں۔ یعنی اسلامی ملکوں میں تباہی و بر بادی کے اسلحے کی تیاری، خصوصاً پاکستان کا ائمہ دھماکہ اور ایران و عراق کا اسے حاصل کرنے کی کوشش کرنا، مشرق وسطیٰ کے ممالک میں امریکی سیاسی مفادات کے مستقبل کو محفوظ بنانا، مسلمانوں کی آبادی میں اضافہ اور ترقی یافتہ ممالک میں ہجرت اور مسلم انتہا پسندی کا دنیا بھر میں پھیل جانا۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو اس سارے قفسیے میں پاکستان کی اہمیت دوچند نظر آتی ہے۔

مایوسی کی وجہات اور منظر

ان سطور میں زیادہ تفصیل سے بیان کرنے کا موقع نہیں کہ پاکستان اس سارے عمل میں کس طرح زخمی میں ہے۔ امریکی افواج اور آئی۔ بی پاکستان میں اپنے قدم گاڑ چکی ہیں اور مستقبل کی خبروں، کراچی اور گوادر کی بندروگاہ کے ساتھ ساتھ جنوبی ایشیاء میں سب سے بڑے امریکی ایرونیول نیس کی منصوبہ بندی کی جا رہی ہے۔ ۳۱ اگست کے واقعات ورثہ عمل کو بھارت اپنے حق میں استعمال کرتا آ رہا ہے۔ کشمیر کی آزادی کی تحریک کو پاکستان کی دراندازی کی پالیسی قرار دے کر مسلسل دباؤ بڑھایا جا رہا ہے۔ گجرات میں مسلمانوں کے بے دردانہ قتل و غارت گری میں ریاستی سازش کا انکشاف اور اب تمام مجرموں کو عدالتی کارروائی سے خارج کیا جانا، بھارت میں مسلمانوں کے مستقبل کو مزید اندریتوں میں بدلنا کرنے کے لیے کافی ہے۔

یہ اور دوسرے بہت سے عوامل وہ فضا پیدا کر رہے ہیں جن میں مسلمان خصوصاً پاک و ہند کے مسلمانوں کے مستقبل کے حوالے سے گومکوی خطرناک کیفیت پیدا کر رہے ہیں۔ جب مستقبل کی سمت راہ التباس میں کھو جائے تو قومیں بھٹک کر بر بادی کی کسی بڑی کھاتی میں گر کر مٹ جانے کے عمل کا شکار ہو جاتیں ہیں۔ اس فضائیں ہمیں نئے سرے سے اردو گرد کے ماحول کا اپنے مقصد کے حوالے سے جائزہ لیتا ہے۔ مایوسی اور گومکوہ حل آگے بڑھنے کی امنگ ہے۔ امنگ ایک خاص جذبہ محکمہ سے جنم لیتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں وقت کی سیکنی کا تقاضا یہ ہے کہئی حکمت عملی ترتیب دیں تاکہ سمت کی تازہ طاقتیں ہمیں آگے بڑھنے پر اسکیں۔ اس کے لیے ہمیں جو (ثقافتی ورثہ، فکر اقبال اور پاکستان) میرے ہے اسی کے تسلیل کو بنیاد بنا کر آگے بڑھنا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسے تصور اقبالستان کا نام دیا جا رہا ہے۔

داخلی سطح

داخلی سطح کو دو حصوں میں یعنی پاکستان اور بھارت کے تناظر میں پیش کیا جاسکتا ہے۔ ۱۔ ہندوستان کے منظر میں ۷۸۵ء کا واقعہ تاریخ کی تبدیلی کا ایک بڑا واقعہ ہے۔ مسلمانوں سے اقتدار چھن گیا۔ پہلے انگریزوں اور پھر ہندوؤں کو اقتدار ملا۔ دوسرا ہم

واقعہ ۱۹۳۷ء میں قیام پاکستان کا واقعہ ہے جو مسلمانوں کے باقی رہنے کی جدوجہد کی ایک علامت ہے۔ مسلمان سارے ہندوستان میں پھیلے ہیں۔ اس لیے ان کے مستقبل کی بات سارے ہندوستان میں ہوتی رہی ہے اور ہوتی رہے گی۔ بھارت میں BJP کی حکومت کے بعد اور ہندوادتا (ہندو نیشنل ازم) کو سرکاری سطح پرلانے کے بعد مسلمانوں اور دوسری اقلیتوں کے تحفظ اور باقی رہنے کا سوال پھر پوری شدت سے سامنے آیا ہے۔ ان سطور میں ہندوادتا کے تحت ہندوؤں کے عزائم اور نصب العین کی مختصری نشاندہی ضروری محسوس ہوتی ہے۔

۱۔ ۱۸۵۷ء کے واقعہ سے پہلے مغلیہ حکومت برائے نام رہ گئی تھی۔ اس لیے ہندوؤں نے

مسلمانوں کے اقتدار و وجود سے متعلق اپنے عزم کو سامنے لانا شروع کر دیا تھا۔ یہ پر اپیگنڈہ کہ مسلمان حملہ آوروں نے ہندوستان کی خوشحالی اور اتحاد کو پارہ کیا ہے۔

مسلمانوں کا اقتدار لوٹ مار، آبروریزی اور بستگنی پر مشتمل رہا ہے۔ اس طرح کالنزیچر

تقریباً تمام زبانوں میں سامنے لایا گیا ہے۔ مثال کے طور پر زماداس ہینکر (Das Hankar) اور نابن چندرہ سندر (Nabin Chandrasen) کی نظم جو ۱۸۷۵ء میں شائع

ہوئی، خواتین کی بے حرمتی کو بطور علامت BJP نے ۱۹۸۰ء میں اپنی مہم کا بھرپور حصہ بنایا۔

۲۔ ہندوستان کے اصل وارث ہندو ہیں۔ مسلمان حملہ آور خارجی لوگ ہیں۔ ہندوادتا کا یہ

بنیادی اصول ہے۔ ۱۹۲۳ء میں وینہاک دمودار سادار کرنے اپنی کتاب: *Hinduata*

Mis Anhi Aصولوں کی بنیاد پر تشریح اور تعریف کی۔ جبکہ ۱۹۳۹ء میں

گواکرنے ہندوادتا کو جرمن نازی ازم کے ساتھ جوڑنے کی سعی کی۔ یہ کتاب *We or Our Nation*

کے نام سے شائع ہوئی۔

۳۔ قیام پاکستان کو روکنے کے لیے ۱۹۴۰ء کو پورے ہندوستان کی سطح پر ہندوؤں نے ایک مظاہرہ کیا۔ اس مظاہرے کی خاص بات ایک قرارداد ہے جو تقریباً ہر مظاہرے میں پڑھی گئی۔ یہ قرارداد مکمل طور پر اس کتاب میں شامل ہے۔

۴۔ ہندوادتا یا ہندو نیشنل ازم کا پہلا عملی قدم ایودھیا میں بابری مسجد کا انهدام ہے۔ یہ واقعہ اب

ایک علامت بن گیا ہے۔ اس قدم سے ہندوؤں نے اپنے ثقافتی ورثے کی بحالی کا جو

عزم کر رکھا تھا یہ اس کا پہلا مظاہرہ ہے۔ مسلمان پہلے ۱۸۵۷ء اور پھر ۱۹۳۷ء کے بعد

جن خدشات کا شکار تھے، یہ ان پہلا عملی ثبوت ہے۔ جو تنظیمیں اس فکر کے لیے سرگرم عمل ہیں ان میں VHP، RSS، برجنگ دل اور BJP سرفہرست ہیں۔ ہندوستان کا موضوع خصوصاً بابری مسجد کے انهدام کے بعد ملکی اور مین الاقوامی سطح پر موضوع بحث ہے۔ مغرب میں ہندوستان کے پس منظر میں ہندوستان اور مسلمانوں کے مستقبل کے حوالے سے خاصے سوالات اٹھائے گئے ہیں اس حوالے سے بہت سی کتابیں میر ہیں۔ مطالعے کے لیے درج ذیل کتب مناسب رہیں گیں۔

1)- *Contesting the Nation* Edited by David Luddin (1996)

2)- *The Saffron Wave* By Thomas Blom Hansen (1999)

3)- *India and Pakistan* By Ian Talbot (2000)

ای این نالبوٹ کو نشری یونیورسٹی میں تھرڈ ورلڈ سٹڈی کے ڈائریکٹر ہیں۔ بھارت اور پاکستان کی سیاسی تاریخ پر کام کرتے ہیں۔

۵) ہندوستان کے مسلمانوں کی زندگی کے اندر جنتجو کا داعیہ اور استعداد عمل ناپید ہو چکا ہے اور ماہی جنم لے چکی ہے۔ ۱۸۵۷ء میں مسلمانوں سے قوت اور اقتدار انگریز نے چھینا تھا۔ مسلمانوں پر یہ بہت کڑا وقت تھا۔ مگر اجتماعی شعور نے سرید احمد خان اور علامہ اقبال کی فکری قیادت میں حالات و واقعات کی روشنی میں نئی سمت اور نئی حکمت عملی کے تحت جدوجہد کو ایک خاص رُنگ دیا۔ اور یوں ۱۹۴۷ء میں مسلمانوں کی نمائندگی، تحفظ کی حکمت عملی اور آگے بڑھنے کی جنتجو کی خاطر پاکستان حاصل ہوا۔

ضرورت اس امر کی تھی کہ جس گرداب سے نکلنے کے لیے جن بزرگوں نے جوراہ متعین کی تھی، اس پر عمل کرتے ہوئے آگے بڑھیں۔ مگر ایسا نہ ہو سکا اور ۱۹۴۷ سال بعد بھی ہمارے پاس آگے بڑھنے کی کچھ سہیل نہیں ہے۔ بلکہ ماہی بڑھ رہی ہے۔ اس کی وجہات کی ایک طویل تاریخ مرتب ہو سکتی ہے یہاں صرف اشارے دینا، ہی مناسب معلوم ہوتا ہے۔

۱) ماہی کے اسباب میں اولین سبب پاکستان کے حرکتی محور یعنی اقتدار پروفوجی قبضہ ہے۔ دنیا کی تاریخ اور ساری جدید دانش اس بات پر متفق ہے کہ قوم کا اجتماعی شعور ہی طاقت ور عصر ہوتا ہے جو پوری قوم کی اجتماعی دانش کے پوری طرح پھیلنے اور پھولنے سے جنم لیتا ہے۔ یہ موقع پاکستان کو میر نہیں آسکا۔ افواج پاکستان ایک بہترین منظم ادارے کے باوجود قوم کے اجتماعی دانش و شعور کو پروان چڑھانے میں ناکام رہا ہے۔ ناکامی کا سب

سے بڑا ثبوت یہی ہے کہ بار بار فوج سیاسی اقتدار پر قبضہ کرتی ہے اور قومی دانشوری و شعور کا راستہ روکتی ہے اور مایوسی کو گھرا کرتی ہے۔ ساری قوم فوجی افکار کی حرکت کے تابع ہو کر رہ گئی ہے اور یہ بہت ہی محدود میدان ہے۔

۲۔ مسئلہ کشمیر نے پچھلی نصف صدی سے زائد عرصے میں پورے ہندوستان میں انسانوں کو معہ تمام مذاہب کے پیروکاروں اور تمام علاقوں کے مکینوں کو ریغمال بنارکھا ہے۔ تیسرا دنیا کا حقارت آمیز لقب، غربت کے مکمل معنی کا عملی ثبوت اور ہر ترقی و بہبود سے نا آشنائی کا ایک ماذل ہے۔ بھارت کی تو ایک باقاعدہ کشمیر پالیسی ہے اور وہ اس پر آگے بڑھتا رہتا ہے۔ پاکستان کی کشمیر پالیسی عوامی شعور کے برعکس رہی ہے۔ اس لیے مایوسی کا سبب بنتی رہی ہے۔ موجودہ جاری جدوجہد کو دہشت گردی کے سائے میں لا کر متعدد موقف سے ہٹنے کے اشارے، حریت پسندوں کو پہلے شہدے کر اوپر لانا اور پھر انہیں دہشت گرد کہہ کر گرفتار کر کے جیل میں ڈال دینا ایک عجیب و غریب حرکت سے تعبیر کیا جا رہا ہے۔ کے خبر ہے کہ پاکستان و کشمیر کے مسلمانوں کے علاوہ بھارت کے مسلمانوں کو بھی کتنا مایوس کن پیغام گیا ہے۔ تاریخ میں اس طرح کی حرکتوں کو دشمنی سے تعبیر کیا جائے گا۔

۳۔ مایوسیوں کو ایک اور بڑا سبب انسانی سہولتوں کا فقدان ہے۔ الیکٹرانک اور پرنٹ میڈیا جب تک نہ تھا یا محدود تھا تو پاکستان کے لوگوں کو اس کی خبر نہ تھی کہ دنیا میں انسانوں کو سہولتیں کس قدر میسر ہیں اور ہمیں یہ میسر نہیں ہیں۔ جبکہ زیادہ تر ملکوں میں انسانوں کو یہ سہولتیں اور ترقی گزشتہ نصف صدی میں ہی حاصل ہوئی ہے۔ ترقی یافتہ ملکوں کو چھوڑ کر چند اور ممالک نے بھی حیران کن طور پر اپنے عوام کو ترقی و خوشحالی کے راستے پر کامیابی سے ڈال دیا ہے جو پاکستان کے ساتھ یا اس کے بعد دنیا کے نقشے پر آئے اور مایوسی تب پیدا ہوتی ہے جب آپ کو معلوم ہو کہ فلاں قوم یا ملک نے گزشتہ نصف صدی میں ترقی کی منازل یوں طے کی ہیں کہ ان کا سیاسی نظام عوامی شرکت کے بھرپور انداز میں داخل ہونے کے بعد مستحکم ہو چکا ہے۔ جبکہ ہمارا سیاسی نظام عوامی شرکت سے دور رہ کر محض ایک ادارے کا مر ہونا منت ہے۔

۴۔ معاشی لحاظ سے کئی ممالک خط غربت کو بہت پچھے چھوڑ چکے ہیں اور ہمارے ہاں اکثریت خط غربت کے بہت نیچے ہیں۔

۵۔ تعلیمی اعتبار سے دنیا کے تمام ترقی پذیر ممالک نے ترقی کی ہے اور ہماری شرح خواندگی ۳۰% سے اوپر نہیں جا رہی ہے۔

۶۔ صحت کے میدان میں عوام کو سہولتوں کے لحاظ سے دوسرے ممالک کا نظام دیکھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ وہاں نظام وقت اور جدید دریافت و سہولتوں کے ساتھ حکومتی سینئر میں رہا ہے جبکہ ہمارے ہاں سرکاری و غیر سرکاری سہولتیں بس اس قدر میسر ہو سکی ہیں جتنی قصابوں کو نہ بھے خانوں میں میسر ہوتی ہیں۔ جو ممالک زرعی نہیں تھے انہوں نے سمندر پر مٹی بچھا کر یا گھروں کی چھتوں کو کھیت بنا کر فصلیں اگانی شروع کر دی ہیں۔ ہمارے ہاں جوش و جذبے نے ایسا معزکہ مارا ہے کہ کھیت ویران کر کے امریکہ سے گندم خریدنے کو زیادہ ترقی و خوشحالی سمجھنے لگ گئے ہیں۔ صنعتی میدان میں ہر ترقی یافتہ اور ترقی پذیر ملک نے خاطر خواہ ترقی کی ہے۔ جبکہ ہمارے ہاں صنعتی میدان میں بینکوں کے قرضے ڈوبنے کی تازہ خبر ہر آنے والی حکومت اور T.A کانیابلشن سنا جاتا ہے۔

۷۔ سماجی میدان کا نظارہ کچھ یوں ہے کہ جرام میں دن بدن اضافہ، اخلاقیات دن بدن زوال پذیر، اخلاقی بے راہ روی، بے روزگاری میں اضافہ، دوائیوں میں ملاوٹ کر کے قتل کے بندوبست اور اس طرح کی منفی اور گھٹیا حرکتیں پورے معاشرے کو مایوسی کے سمندر میں دھکیل رہی ہیں۔

۸۔ تہذیبی میدان میں جو تماشا ہم نے لگا رکھا ہے وہ ۳۰% کی شرح خواندگی رکھنے والی عوام کیا سمجھے گی۔ ۱۰۰٪ اعلیٰ تعلیمی استعداد رکھنے والوں کی سمجھے سے بالا ہے۔ ہم پاکستانی ہیں یا بلوجی سندھی، پنجابی اور پنجابی ہیں؟ پاکستان جس خطہ ارضی پر مشتمل ہے اس کے زمینی حقوق پاکستانی تہذیب میں کیا کردار ادا کرتے ہیں؟ پاکستانی تہذیب کیا اسلامی تہذیب ہو سکتی ہے؟ ہندوستان کے مختلف حصوں سے ہجرت کر کے کراچی اور دوسری جگہوں پر آباد ہونے والے کیا کوئی اجنبی تہذیب لائے ہیں یا وہ سیاسی محرومی کو تہذیبی الجھن کا شکار بنا کر اپنی الجھن میں مزید آضافہ کر رہے ہیں؟ پاکستان کے خطہ ارضی میں موجودہ علاقائی تہذیب و تمدن کے ساتھ کیا پاکستانی تہذیب کی تشكیل ممکن ہے؟ یہ جو کچھ بیان کیا ہے۔ اگر اس میں الجھ جائیں اور اس کی سمجھتے آئے تو مایوسی کے سوا کیا ہاتھ آئے گا؟

۹۔ فکر کے میدان میں تھی دست ہو کر جنگل کا سامان پیدا کر چکے ہیں۔ جہاں کی ہرنیل و جھاڑی قد آور درخت کا دعویٰ کر رہی ہے۔ جو جتنا نا اہل ہے وہ فکری راہنمائی کا سب سے بڑا دعویٰ دار ہے۔ یہ جنگل کا نقشہ نہیں تو اور کیا ہے؟ یہ سب کچھ پچھلے کئی برسوں سے ڈھول کی تھاپ پر ہو رہا ہے۔ اس کے باوجود کہ ہم اپنے آپ کو وارث قرآن و روایت قرار دیتے ہیں۔ اس کے باوجود کہ دالش مشرق کا تابندہ ستارہ اقبال تخلیق ارض پاکستان کا معمدار و مفکر ہے۔

۱۰۔ مایوسی کا ایک بڑا سبب جو چند برسوں سے سامنے آیا ہے۔ وہ مذہبی منافرت کو جنگلی جنون میں بدلنا ہے۔ مولویوں کا ہر گروہ، ہر مدرسے سے فارغ التحصیل نوجوان اور ہر مسجد کا مولوی اپنے اپنے عقائد کو دوسروں پر مسلط کرنے کی نیت سے میدان میں کو دچکا ہے اور مساجد میں نماز پڑھتے افراد پر بم مار کر انہیں ہلاک کیا جا رہا ہے۔ مساجد کا یہ حال ہے کہ ایک عام آدمی مسجد میں نماز کے بجائے گھر میں نماز پڑھنا مناسب سمجھتا ہے۔ جہالت کو عقائد، اپنے ذاتی افکار کو اسلام اور اپنے مقاصد کو شریعت قرار دے کر جو افراتفری پچھلے برسوں میں سامنے آئی ہے، عام آدمی اس سے مایوس ہوا ہے۔ تہذیبی میدان میں بد تہذیبی بھی اسی مذہبیت کی جنونیت اور مساجد میں قتل و غارت کا شاخانہ ہے۔

۱۱۔ مایوسی کے اسباب کی طرف جو اشارے پچھلی سطور میں کیے ہیں داخلی واقعات اور اقدامات کے نتائج سے ابھرتے ہیں۔ اگلی سطور میں خارجی واقعات و اثرات کی نشاندہی مقصود ہے جو ہلکے یا گھرے انداز میں خطہ ارضی پاکستان کے باسیوں کی فکری استعداد، صلاحیتوں اور جدوجہد پر اثر انداز ہوتی ہے اور مایوسی کے ان دھیروں کو مزید گھرا کرتی ہے۔

تاریخی سبب:

بر عظیم میں مسلمانوں کی مایوسی کا ایک تاریخی سبب بھی ہے جس کا تذکرہ ضروری معلوم ہوتا ہے۔ یہ ہے روحانی جو ہر میں کمزوری، اس جو ہر میں کمزوری و عدم دلچسپی بلکہ مخالفانہ رویہ بھی ہے۔ مایوسی کا بڑا سبب یہاں اسلام کی آمد و پھیلا و اور مضبوطی و یقین کا موجب روحانی تھا۔ روحانی انداز مکمل طور پر دوسرے انسانوں سے ثابت ہوتا ہے۔ اس میں مسلمان، کافر کی تمیز نہیں ہوتی نہ رنگ،

نسل، علاقہ یا زبان کی تفریق ہوتی ہے۔ عرب سے باہر اسلام کے لیے مستقل طور پر روحانیت نے ہی زمین ہموار کی ہے۔ برعظیم میں روحانی بزرگوں کا دور ختم ہوا تو ان کی جائشی میں وہ جان باقی نہ رہی اور رفتہ رفتہ ہر جائشیں بھی مسلم سلطنت کی روایت پر آ گیا، جہاں معیار اولاد تھی، کمال نہ تھا۔ اس کمزوری کے دونستانج سامنے آئے۔ ایک تو یہ کہ اسلام کے حوالے سے غیر مسلموں کے ساتھ معاشرت و تعلق کے رشتے کمزور ہو گئے۔ ایک غیر مسلم جب مسلمانوں کی بات نے گا، ہی نہیں تو وہ تبدیلی مذہب کے عمل سے نہیں گزرا سکتا۔ دوسرا نتیجہ مسلمانوں میں سے ہی ایک گروہ پیدا ہو گیا جو جائشی کے گورکھ دھندے سے نالاں ہو کر سرے سے روحانیت کی مزاحمت پر آ گیا۔ اس گروہ نے علم و تحریر کا سہارا لیا اور بجائے اس کے کہ اس خلا کو پر کرتا، محض روحانیت کے خلاف ایک مجاز بنا کر بیٹھ گئے جس کا مجموعی تاثر یہ پیدا ہوا کہ لوگوں کا روحانیت سے یقین متزلزل ہوا۔ جبکہ اس کے مقابلے میں یقین پیدا کرنے والا جو ہر پیدا نہ ہو سکا۔ پچھلے ایک ڈیڑھ عشرے میں جنت کے جلد حصول کو نصب العین قرار دے کر ایک جہادی فضا پوری دنیا میں پیدا ہوئی۔ حصول جنت کے اس جو ہر نے عسکری رو یہ کو اجاگر کیا اور طاقت کے حصول کا ذریعہ بھی بنایا۔ قطع نظر اس بحث کے کہ اس کے ثمرات کیا ملے؟ مگر حصول جنت کا راستہ موت سے گذر کر ملتا ہے۔ اسلام کا مطمئن نظر دنیا میں انسان کو اس قابل بنتا ہے کہ وہ حصول جنت میں کامیاب ہو سکے۔ یہ تراس خراش روحانیت کے ذریعے ہوتی ہے۔ عبادت و ریاضت اس کے راستے ہیں۔ اس میں رکاوٹ جنم لے تو جہاد فرض عین ہوتا ہے۔

یہ بحث ان سطور کا موضوع نہیں، جو بات عیاں کرنا مقصود ہے وہ یہ کہ روحانیت کو پیری مریدی کے نام پر بدنام کیا گیا ہو یا توحیدی کہلانے کے شوق میں مزاحمت کی گئی ہو، بحیثیت مجموعی اسلام کے اس جو ہر کو کمزور کر کے مایوسی میں اضافہ کیا گیا ہے۔ پچھلی سطور کا خلاصہ یوں بیان کیا جاسکتا ہے۔ یہ تکرار توجہ مرکوز کرانے کی سعی کے طور پر ہے۔

- بھارت میں ہندو اتنا کو ریاستی سطح پر مقاصد قرار دے کر دوسری اقلیتوں کو خوف زدہ کرنا مقصد ہے۔

- بابری مسجد کا انهدام، جس سے یہ پیغام دینا مقصود ہے کہ تمہیں یا تو ہندو ازم میں مدغم ہونا ہے یا بھارت چھوڑنا ہے۔

- تازہ مثال گجرات میں ریاستی سرپرستی اور منصوبہ بندی میں مسلمانوں کا قتل عام ہے جس

کی بازگشت میں الاقوامی سطح پر سن گئی ہے اور تصدیق کی گئی ہے۔

۱۱/۹ کے واقعہ کو اسلام اور مسلمانوں کے خلاف نفرت اور بربادی کے لیے استعمال کر کے ترقی یافتہ ممالک کو اسلامی دنیا سے ایک خاص فاصلے پر رکھنے کا بندوبست کیا گیا۔ افغانستان پر بلا جواز امریکی چڑھائی اس کے علاوہ کچھ نہیں کہ مسلمانوں کے خلاف اظہار بغض او را پنے سڑ-ٹجک مقاصد حاصل کر سکے۔

افغان اور دوسرے مسلمانوں کو کیوبا کے جزیرے میں قید کر کے ان پر غیر انسانی سلوک محض مسلمانوں کے خلاف انتقام اور نفرت کا اظہار ہے۔

صدام سے قطع نظر عراق پر حملہ اور قبضہ سارے انسانی دستوروں کی توہین ہے۔ لیکن اسرائیل کے لیے خطرے کو کم کرنے کے مقاصد نے عراقی مسلمانوں کا ہوا رزا کر دیا ہے۔ اس دوران بھارت کا امریکی طرز اختیار کرنا، دھمکیاں، افواج کا سرحدوں پر لاکھڑا کرنا، مطالبات منوانا اور ساتھ امریکی دباؤ استعمال کرنا۔ بنیادی طور پر تحریک آزادی کشمیر کے خاتمے کا پاکستان سے وعدہ لینا ہے۔

حکومت پاکستان کے چند ایسے اقدامات جو تحریک آزادی کشمیر کی بساط پیشئے کی شاندی ہی کرتے ہیں، مایوسی کا بڑا سبب بن رہے ہیں۔

پاکستان کے ائمی پروگرام کو حکومتی سطح پر ابہام کا شکار کرنا بھی مایوسی کا سبب بن سکتا ہے۔ کراچی اور گوادر کی بندرگاہ کے ساتھ امریکی اڈوں کی خبر بھی اس مایوسی میں اضافے کا سبب بن رہی ہے۔

”جهاد“ کو پہلے ہوادے کر اور پھر امریکی زبان میں اسے دہشت گردی قرار دے کر پاکستان کا امریکہ کی طرف سے مسلمانوں کو قتل کرنے کے ہر اقدام کا ”لیس سر“ اور پھر اس کی پوری ہمنوائی میں امت سے خون دینے والوں کا صفائی کرنا مایوسی میں اضافے کا سبب ہے۔

اس تجزیے کا مدعا یہ ہے کہ اس منظر کی روشنی میں ہم نے باقی رہنے اور آگے بڑھنے کے لیے سمت کا تعین اور حکمت عملی مرتب کرنی ہے۔ مایوسی کو ختم کرنا ہے۔ اس کے لیے تازہ ولوہ درکار ہے۔ تازہ جذبوں کو جنم دینا ہے۔ مستقبل کو تابناک بنانا ہے۔ سازشوں کو ملیا میٹ کرنا ہے۔ نفترتوں کو بڑھانا نہیں بلکہ کم کرنا ہے۔ برعظیم کا مسلمان عدم تحفظ کا شکار ہوتا ہے تو گویا برعظیم کا ہر انسان عدم تحفظ کا شکار ہو جائے گا۔ ہمارے پاس مذکورہ تین بنیادی عنصر یعنی تاریخی ورثتہ کی طاقت، فکر

اقبال اور پاکستان ہیں۔ تاریخی ورثہ کی طاقت کو اقبال نے اپنی فکر میں ولوہ انگلیز طور پر سویا ہے اور اس فکر کا پہلا نتیجہ پاکستان ہے۔ انہی تین عناصر پر مسلمانوں کی اگلی حکمت عملی کا دار و مدار ہے۔

”تصور اقبال تان“ دراصل انہی تینوں عناصر کا اگلا پڑا وہ ہے۔ اقبال کی فکر حرکی ہے، کوئی بھی فکر حرکی نہ ہوتا دم توڑ دیتی ہے۔ اقبال کی فکر ابھی تازہ دم ہے۔ ایسے ہی میرے نزدیک ”پاکستان“ کا تصور بھی حرکی ہے۔ ہم نے پاکستان کو جامد کرنے کی حکمت عملی اپنائی، بنگلہ دیش اس حکمت عملی کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ ”پاکستان“ اقبال کی فکر کا آخری نہیں بلکہ پہلا نتیجہ ہے۔ یہ ایک بات سمجھ لینے سے ہمارے بہت سے فکری مغالطے خود بخود رفع ہو جاتے ہیں اور ”تصور اقبال تان“ کو سمجھنے میں بھی آسانی ہو جائے گی کہ ”پاکستان“، فکر اقبال کا اولین سورچہ اور صفت بندی کا عمل تھا۔

حوالی

- ۱۔ پروفیسر عزیز احمد، بر صغیر میں اسلامی کلچر بحوالہ انڈین اسلام از مرے ٹائنس، ص ۱۰۸
- ۲۔ مائیکل ایلیٹ، ٹائم میگزین، ۱۵ اکتوبر ۲۰۰۱ء
- ۳۔ ارشاد احمد حقانی روزنامہ جنگ ۲۲ جولائی ۲۰۰۳ء
- ۴۔ یہ مختصر جائزہ ہے۔ اس ضمن میں تفصیلات اس تحریر میں موجود ہیں۔ تکرار پر مذدرت
- ۵۔ پروفیسر ای این ٹالبوٹ سے اس موضوع پر کتب کی فرمائش کی تو انہوں نے تین چار کتب تجویز کیں جن میں سے مذکورہ دو کتب مجھے میر ہو سکیں۔

دوسرا حصہ

اقبالستان --- چند بنیادی باتیں

مذاہب ہوں، فلسفے ہوں، سائنس ہو، سیاست ہو، معيشت ہو یا اخلاقیات ہوں، یہ سب کہانی تو اس بات کے گرد گھومتی ہے کہ انسان دوسرے انسانوں کے ساتھ اکٹھے رہنے کے مقصد میں کتنا کامیاب ہوا ہے۔ اصطلاحاً جسے ہم معاشرہ کہتے ہیں، اس کو کہاں تک مثالی کہہ سکتے ہیں؟ ظاہر ہے مثالی معاشرے کا کوئی معیار ہوگا۔ معیار پر اختلاف کے باوجود دنیا کے تمام مذاہب کے اہل بصیرت انسان کے انسان سے تعلق اور اس کی ترقی و بہبود کو ہی معیار کی بنیاد قرار دیتے ہیں۔ ہمیں یہ غرض نہیں کہ بھارت ہندوata کو مقصد بناتا ہے یا سیکولریزم کو۔ سوال یہ ہے کہ بھارت میں بننے والے ہندوؤں کے علاوہ دوسری اقوام کے ساتھ بھارت کا رویہ کیسا ہے؟ بھارتی سیکولریزم سے متعلق مسلمانوں کو جو خوش فہمی تھی وہ عملی لحاظ سے فسادات اور خوف زدہ کرنے کی پالیسی کی بدولت ختم ہو گئی ہے۔ ہندوata کو سرکاری منشور و مقصد قرار دینے سے نئی بات اس قدر سامنے آئی ہے کہ تمام اقلیتوں کو رہنا ہو گایا جانا ہو گا، رہنا ہو گا تو ہندو بن کر، بصورت دیگر یہاں راستہ صرف جانے کا رہ جاتا ہے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایکسویں صدی کے آغاز پر عظیم کے انسان نے صدیوں کے سفر کے بعد کیا حاصل کیا؟ اُس نے مقصد انسانی کو کس حد تک پورا کیا؟ یعنی انسان کا تعلق انسان سے کتنا قریب کیا اور معاشرت کو خوف و غم سے کس قدر نجات مل گئی ہے۔ ہمارے لیے ماضی قریب کے تجربے اور موجودہ حالات میں بظاہر کوئی تبدیلی نہیں آسکی ہے۔ مولوی اور پنڈت مسلسل معاشرت کے مؤثر ادارے کے طور پر اپنے اثرات مرتب کر رہے ہیں اور چونکہ دونوں حضرات کے فلسفہ تبلیغ کا مرکزی نکتہ نفرت ہے محبت نہیں اس لیے آگ کے گولے ہی پھینکے جا رہے ہیں اور فضاح وقت نفرت کے ان گولوں کی زد میں رہتی ہے۔

انسان کا شعور انسان سے محبت اور قربت کی را ہیں تلاش کرنے کے بجائے جہاں دوسرے انسانوں کو محض مذہب و عقیدے یا نسل یا زبان کی بنیاد پر مٹانے کے لیے محپرواز رہتا ہوا محالہ اُس

معاشرے کا انتشار میں بٹلار ہے کامل تیز تر ہو جاتا ہے۔ اور جس کو مٹانے کی تدبیر کی جاتی ہے وہ مزاحمت اور نہ مٹنے کی تدبیر کرتے ہیں۔ وہ تھوڑے ہوتے ہیں، کم ہوتے ہیں مگر چونکہ مٹنے کے عمل سے دوچار کیے جاتے ہیں، اس لیے ان میں مزاحمت کی قوت مضبوط تر ہوتی جاتی ہے۔ معاشرے کا انتشار ان کی ضرورت بن جاتی ہے۔ جبکہ مٹانے والوں کے لیے معاشرے کو انتشار سے دور رکھنا، ہی مقصد اور کامیابی کا معیار ہوتا ہے۔ یہ تجربہ کشمیر کے حوالے سے بھارت و پاکستان تو پہلے ہی کر رہے تھے۔ اب نئے میدان میں داخل ہو رہے ہیں۔

”ہندوata“ اب بھارت کی معاشرت میں اقلیتوں کو مزاحمت کئے نئے راستوں پر لگا رہا ہے۔ مسلمان اور عیسائی اور سکھ مزاحمت کے نئے راستوں کی تلاش میں ہیں۔ وہ مزاحمت کے کئی نئے راستوں کا انتخاب کر پاتے ہیں اور کتنے کامیاب ہوں گے یہ سوال تو وقت اور فاصلے کا ہے، جس کا جواب مستقبل قریب میں سامنے آئے گا۔ مگر کم سے کم جو مقصد یہ اقوام حاصل کر لیں گی۔ وہ بھارتی معاشرت کا انتشار اور عدم استحکام کا شکار ہونا ہے۔ جموں کشمیر کے حوالے سے بھارت کی معاشرت کو داخلی طور پر کسی مزاحمت کا سامنا نہیں تھا بلکہ اس موضوع پر معاشرہ ریاست کی پشت پر رہا ہے۔ اب معاملہ اقلیتوں کا ہے، ان کی زندگی کا ہے۔ اس لیے بھارت کا معاشرہ اب داخلی تضادات کی لپیٹ میں آنے والا ہے۔ چھوٹی ذات کے ہندوؤں کا مسئلہ ابھی چل رہا ہے۔ ہندوؤں کا بطور مذہب حصہ ہونے کے باوجود معاشرہ ان کو تصور انسانی کے مطابق برداونہیں کرتا۔ ایک انسان کا دوسرے انسان کو حقیر جانا ایک ایسا خوف ناک اور فتح فعل ہے جو واضح طور پر انسان کی تو ہیں ہے۔ انسانی تو ہیں پرقدرت کے ہاں معافی کی گنجائش نہیں ہے۔

کسی ریاست کا بنیادی مقصد تحفظ جان، تحفظ عقیدہ، تحفظ عزت اور تحفظ مال ہوتا ہے اور یہ مقصد قبائلی ریاست سے لے کر آج کی وطنی و علاقائی ریاستوں سے گزرتے ہوئے آفاقی (Globel) ریاست تک کے تصور کا لازمی حصہ ہے۔ یہ وہ معیار ہے جس کی بنیاد پر کسی ریاست کو پرکھا جاسکتا ہے۔ بھارت نے ریاستوں یا صوبوں کا اضافہ کیا۔ انتظامی صورت کی مناسب تقسیم کی مگر وہ نہ ہی اقلیتوں پر ہندو اکثریتی دباؤ اور یلغار کو کم نہ کر سکا۔ بلکہ BJP نے آکر اس دباؤ اور یلغار کو ”ہندوata“ کی سمت دے کر ریاستی فرائض کی باقاعدہ نشاندہی کی اور اب ہزار کوشش کے باوجود اقلیتوں کو یہ باور کرنا ممکن نہیں ہو گا کہ بھارتی ریاست ہندو کے علاوہ لوگوں کے تحفظ جان، تحفظ عقیدہ، تحفظ عزت اور تحفظ مال کی ذمہ دار ہے۔ اس کی کئی مثالیں موجود ہیں اور چند ایک کا اس تحریر میں ذکر شامل ہے۔

جب کہ دوسری طرف ہندو اکثریت میں بھی ایک اقلیت ہے جس کو بظاہر ہندو مذہبی دائرے میں شمار کیا جاتا ہے مگر انہیں پورا انسانی درجہ دینے کی کوئی سبیل کم از کم موجودہ جاری ہندومعاشرے میں ممکن نہیں ہے۔ یہ ہندوؤں کے بڑے تین سماجی طبقوں کی نوکری اور خدمت کے لیے ہیں۔ خدمت اور نوکری سماج کا حصہ تو ہو سکتا ہے لیکن مذہبی بنیاد پر ہزاروں سالوں سے کسی طبقے کو سلی طور پر خدمت یا غلامی پر مامور رکھنا تو ہیں انسان ہے۔ یہ شودرا اور بیچلی ذات کے لوگ ہیں۔ جنہیں بظاہر مذہبی بنیاد پر استعمال کیا جاتا ہے۔ ہندو مذہب کے بعض دعویداروں کے مطابق ان کے بنیادی الہامی لشیچر میں انسانوں کو درجے میں نیچے رکھنے اور کم تر انسان قرار دینے کی گنجائش نہیں ہے۔ لیکن یہ سلسلہ صدیوں سے جاری رکھا ہوا ہے اور ہندومعاشرے میں اس کے خلاف کم ہی آواز بلند ہوئی ہے۔

غلام، خدمت گار اور نوکر جبکہ اصطلاح میں جامع لفظ غلام ہے۔ خدمت گار اور نوکر کے الفاظ ملکے معنی میں استعمال ہوتے ہیں۔ اسلامی تعلیمات نے آزاد اور غلام کے دو سماجی طبقوں کی عرب کے معاشرے کے تناظر میں نشاندہی کی اور غلام کو کم تر انسان ہونے کا احساس دلا کر تکمیل ذات کا نصب العین دیا۔ آزاد اور غلام انسان کے سامنے ایک نصب العین رکھا کہ آزاد انسان غلام انسان کو آزادی کی راہ پر لے جائے۔ یہی وجہ ہے کہ پیغمبر اسلام ﷺ نے مال دار لوگوں کو غلام انسان کو آزاد کرنے، کسی غلطی یا کوتاہی کے ازالے کے لیے غلام انسان کو آزاد کرنے اور محض نیکی کی خاطر بھی غلام کو آزاد کرنے کی تلقین کی۔ یہ واضح قرآنی تعلیمات ہیں جن کی تعبیر، تاویل یا بحث کی گنجائش نہیں اور اگر کوئی ہندو بڑی ذات کا یا غلام ذات کا مطالعہ کرنا چاہے تو اسے ہر زبان میں اس موضوع کو سمجھنے کے لیے مواد ملے گا۔

سماج میں اس مسئلے کو ایک خاص انداز سے حل کرنے کی ترغیب دینا حکمت عملی تھی جس کے ذریعہ اثرات مرتب ہوئے اور یہ سب تاریخ کا روشن باب ہے۔ انسانوں کو یہ باور کرایا گیا کہ انسان بطور انسان غلام پیدا نہیں ہوتا۔ یہ انقلاب انگلیز پیغام ہی دراصل انسان کی انسان سے آزادی کا وسیلہ بننا۔ دین اسلام میں انسان کو انسان کی غلامی سے نجات دلانے کی ترغیب کو فلاح دنیا اور آخرت سے جوڑ کر غلامی کے خلاف ایک شعور کو مضبوط بنیادوں پر استوار کر دیا جبکہ ہندو ازם میں ایک پوری نسل و بیشہ کے لیے ایک درجے پر محدود و مقید کر کے معاشرے میں ان کو چوتھے درجے کا شہری قرار دیا گیا۔ المیہ یہ ہے کہ ہندو ازם میں رہتے ہوئے یہ لوگ چوتھے درجے کے شہری یا انسان سے اوپر نہیں اٹھ سکتے۔

اقبالستان کے تناظر میں آنے کے میں الاقوامی ریاستی تصریروں اور اُنہاں مناسب معلوم ہوتے

یہے تاکہ بھارت کے گزشتہ کردار اور موجودہ صورت حال کا بہتر اور اک ممکن ہو سکے۔ شرائط جیسے تفصیلی بحث کی گئی ہے، معیارات ہوتے ہیں، جو وقت کے ساتھ اہل بصیرت تعین کرتے رہتے ہیں اور انسان اُس کے لیے جدوجہد کرتے ہیں جبکہ ریاستیں اُس جدوجہد کو منظم کرتے ہوئے انسان کے لیے ممکن حد تک نتائج مرتب کرتی ہیں۔

ریاست کو اب ایک سیاسی فلاسفی کی اکائی سمجھا جاتا ہے۔ زمانہ بدلتا ہے اور اس کا رخ عمومی طور پر آگے بڑھنے کی طرف رہتا ہے۔ ریاست انسانوں کے ایک منظم گروہ کا نام ہے جو اجتماعی طور پر تحفظ حیات، تحفظ عقیدہ، تحفظ عزت، اور تحفظ مال کی حکمت عملی طے کرتی ہے۔ اس کے لیے شرط یہ نہیں کہ سب ایک عقیدے کے لوگ ہوں یا سب ایک نسل یا ایک رنگ یا علاقے کے لوگ ہوں۔ ریاست کو بلا امتیاز سب کی حفاظت کرنی ہوتی ہے اور سب کو دوسروں کے احترام کا شعور دینا ہوتا ہے۔

بھارت اور پاکستان کی دونوں ریاستیں ۱۹۴۷ء میں قائم ہوئیں۔ پاکستان میں دوسری مذہبی اقلیتیں کم ہیں۔ پاکستان جدید دور کے ریاستی تصور کی شرائط یا اسلامی ریاست کی شرائط پر پورا نہیں اترتا۔ لیکن مذہبی اقلیتوں کو مذہبی ذات تصور کرنے کے روایانہ اندماز کی حوصلہ افزائی نہیں کی گئی۔ لوگوں کی حالت تو واضح طور پر تیسری دنیا کے درجہ پر ہے۔ معاشرتی حالت یا سیاسی حالت یا معاشی حالت قابل رشک کبھی نہیں رہی اور اب بھی فوجی اور آمرانہ انداز کی حکومتوں سے بہتری کی توقع ممکن نہیں مگر یہ خستہ حالی اجتماعی ہے۔ اس میں مذہبی نسلی یا زبان یا علاقے کے امتیاز کو زیادہ دخل نہیں ہے۔ یہ محض ریاستی شرائط پر پورا نہ اترنے کی بنا پر ہے۔

دوسری طرف بھارت میں ریاستی سطح پر خصوصاً BJP کے سیاسی اور ریاستی سطح پر ابھرنے کے بعد مذہبی بنیاد پر دوسروں کو مٹا دینے کے فلفے نے بھارتی ریاست اور ہندووازم کے کھوکھلے پن کو بری طرح آشکار کر دیا ہے۔

ماضی کی انسانی روایت اور دور حاضر کی علمی ترقی کی بناء پر اہل بصیرت نے انسانی شعور کی ترقی کی مناسبت سے ریاست کے بعض اعلیٰ ترین مقاصد اور نصب العین کا تعین تو کر لیا ہے۔ لیکن انسان کے حصوں کے لیے ابھی مطلوبہ سطح پر نہیں پہنچا اور یہ جدوجہد محض ارتقاء میں ہے۔ بعض برطانوی سکالروں کا خیال ہے کہ جمہوریت ابھی کتابوں میں ہے۔ سب سے بڑی جمہوریت برطانیہ کے وزیر اعظم (ٹونی بلیئر) فیصلہ پہلے کر آتے ہیں۔ پارلیمنٹ سے منظوری بعد میں لیتے ہیں اور یہ بات جمہوری روح کے خلاف ہے۔

انسانی روایت اور عصر حاضر کے اہل بصیرت نے ریاست کے ذیل میں مختلف جہتوں سے

انسانی نصب الاعین پر بات کرنے کی کوشش کی ہے۔ جس میں ریاست کی حیثیت (Authority) اور طاقت (Power) کی وضاحت کی ہے۔ حقوق آزادی، مساوات اور انصاف کو ریاست کی بنیادی شرائط قرار دیا ہے۔ بلکہ ان سب باتوں کو ”انسانی حقوق“ کے میں الاقوامی چارٹر کا حصہ قرار دیا ہے۔ بیسوی صدی میں فلاجی ریاست کا تصور دوبارہ انسانی شعور کا حصہ بننا ہے۔ یورپین مصنفین کے مطابق تو یہ تصور قریب ترین ماضی کا ہے۔ لیکن وہ عرب کے ابتدائی اسلامی معاشرے کا جائزہ لیے بغیر یہ رائے قائم کر رہے ہیں۔ جس پر بہر حال آج نہیں تو کل ضرور نظر ثانی کریں گے۔ آزادی حقوق، مساوات اور انصاف ریاست کے فرائض منصبی میں شامل ہے۔ حکومت ریاستی فرائض کی ادائیگی کا ایک اظہار ہے۔ حکومت کا عوامی آراء سے وجود میں آنا اور عوامی شرکت لازمی شرائط ہیں۔ مسلمانوں نے اس کا نام خلافت رکھا اور جدید دور نے اس کا نام جمہوریت (Democracy) رکھا۔ یہ دونوں حکومتیں اس بات پر اصرار کرتی ہیں کہ انسان کی عزت، عظمت، حقوق آزادی اور انصاف بنیادی اصول ہیں۔ ایک کا تعلق ماضی سے ہے اور دوسری کا دور جدید سے۔ خلافت کا تصور ابتدائی چند سالوں کے بعد محض روایتی طاقت کے نظام تسلی چلا آیا تھا اور آج کی جمہوریت بھی طاقت کے نظام کے تحت چل رہی ہے۔ مگر اس وقت یہی ماذل مقبول ہے اور انسانی تجربات کا بہتر حاصل ہے۔ غالباً یہ جملہ مفترضہ جاری بحث سے زیادہ تعلق نہیں رکھتا۔ لیکن یہ اجاگر کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ انسان کی شعوری ترقی نے بہر حال ایک سفر طے کر کے ریاست کی شرائط کو انسانی شعور کا حصہ بنانے کی کوشش کی ہے۔ اس لیے آج کا انسان ریاستوں کو ان اعلیٰ انسانی مقاصد کی شرائط پر پورا اترتے دیکھنا چاہتا ہے۔

بھارت کے اندر خصوصاً حالیہ دور میں ان آفاقی شرائط ریاست کی کھلم کھلا خلاف ورزیاں کی گئیں ہیں۔ تصور اقبالستان اُسی کا رد عمل ہے۔ نظام کی جبریت کے خلاف مراحت کا جنم لینا فطرت انسان کا تقاضا ہے۔ بھارت میں اقلیتوں کو زمانہ جدید کے حربوں کے تحت ڈرادھما کر ”ہندو بنو یا بھارت چھوڑو“، جیسے نعرے مراحت پر ابھارتے ہیں۔

بھارت کے اندر کئی مذاہب کے ماننے والے ہیں۔ ہندو مذہب کے ماننے والوں کی اکثریت ہے۔ جبکہ مسلمان، عیسائی، بدھ، جین مت، پارسی اور سکھ اقلیتی حیثیت رکھتے ہیں۔ ہندوؤں کو اکثریت کے اصول جمہوریت و حکومت کے تحت حکمرانی کا پورا حق حاصل ہے۔ لیکن دوسروں کو اقلیتی بنیاد پر غلام رکھنے یا مٹا دینے کا قطعی حق نہیں ہے۔ ہندو اکثریت نے حکمرانی کے حق کی حدود پار کر لی ہیں اور یہی معاملہ تحفظ وجود، تحفظ عقیدہ اور تحفظ مال کے عالمگیر اصول کی

خلاف ورزی کا پیش خیمه بننا اور اس بحران سے تصور اقبال تاں ابھرنا نظر آ رہا ہے۔

جہاں تک اقبال تاں کا تعلق ہے یہ صرف مذہبی اقلیتوں تک محدود نہیں رہ سکتا کیونکہ اس کا اعلیٰ ترین مقصد ”انسان کو خوف و غم سے نجات دلانا ہے“، اس لیے ہندو مذہب میں مذہبی طبقات کی تاریخی تقسیم کے تقدیس کا معاملہ صدیوں سے مذہبی بنیاد پر احتصال کا موجب بننا ہوا ہے۔ شودرا اور پنجلی ذات کا ہندو صدیوں سے شودرا اور پنجلی ذات میں ہی شامل ہے۔ ان کا دور نہیں بدلا، دنیا میں بہت کچھ بدلا۔ مگر برہمن، کھشتري اور ولیش الٹ پلٹ نہیں ہوئے۔ شودرا اور پنجلی ذات اگر انہیں تو پھر اس سطح سے اوپر اٹھنے کی انہوں نے ترقی کیوں نہیں کی؟ دراصل یہ مذہبی کہانی صرف چند انسانوں کو درجہ حقوق سے نیچے رکھنے کا بہانہ ہے۔ یہ روشن کئی دوسرے مذاہب میں پائی جاتی رہی ہے مگر وہ تبدیلی کے عمل سے ضرور گزرے ہیں۔ اس لیے اقبال تاں کا مقصد ان ہندوؤں کو بھی شعوری عمل سے گزارنا ہوگا۔ اقبال تاں، کا یہ سیاسی مشن نہیں ہوگا بلکہ یہ تبلیغی و انسانی مشن ہوگا۔ اقبال کے اجداد برہمن تھے۔ قدرت کا نظام ہے کہ اقبال نے نسل ایک مذہبی سفر طے کرنا تھا اور اقبال کو ”اقبال“، اسلام کے راستے سے بننا تھا۔ وہ برہمن رہ کر جھوٹی اور پنجلی ذات کے ہندوؤں کو اور بھارت میں دوسری اقلیتوں کو اتنی آزادی سے پیغام انسانیت نہیں دے سکتا تھا۔ ”اقبال“، ہندوستان کی مٹی کا باسی ہے۔ اُس نے اسی مٹی سے جنم لیا۔ اور انسان کا پیغام برمرا۔ اُس نے مولوی اور پنڈت کو بنیاد نہیں بنایا۔ اُس نے انسانیت کو بنیاد بنایا۔ مولوی نے اُس پر کفر کے فتوے لگائے اور پنڈت نے اُسے ملعون قرار دیا۔ مگر وہ انسانیت کا داعی تھی۔ وہ سچا تھا اس لیے کہ اس کے پیغام میں انقلاب تھا، جوش تھا، ولولہ تھا۔ اس لیے وہ زندہ ہے اُس کا پیغام زندہ ہے۔ مسلمانوں نے جب اُسے پڑھا تو جواں ہمت ہو گئے اور اپنے تحفظ وجود ذات کے لیے پہلا مورچہ ”پاکستان“ حاصل کر لیا۔ ایران کے عوام کو امام خمینی نے جب اقبال کے فارسی کلام کی طرف توجہ دلائی تو ایرانی عوام میں جوش و ولولے کی ایسی طغیانی آئی کہ ”شہنشاہوں کے دربار الٹ گئے“، کی مثال کو چ ثابت کر دکھایا اور امریکہ جیسی قوت کے خلاف پچھلے ۲۵ سالوں سے ڈلے ہوئے ہیں۔

بھارت کے پنجلی ذات کے ہندوؤں کو اگر یہ ثابت کرنا ہے کہ جب بقول ڈارون بندر سے انسان بننا تو پنجلی ذات کا ہندو بھی اُس قطع میں شامل تھا۔ ڈارون نے بھی یہ نہیں بتایا کہ کچھ بندر پنجلی ذات کے تھے۔ اس لیے وہ اسی طرح آگے چلے آئے جبکہ تمام مذاہب کا نقطہ نگاہ یہ ہے کہ انسان کی پیدائش قدرت کا تخلیقی کارنامہ ہے اور اقبال نے اسی نقطہ نگاہ کے تحت انسان کو انسان کی غلامی اور اس کی تحقیر سے روکا ہے۔

نچلی ذات کا ہندو بھی ”انسان“ ہے۔ اس کو اوپر اٹھنے کا اتنا ہی حق ہے جتنا ایک بڑی ذات کے ہندو یا ایک مسلمان کو ہے۔ اس کے لیے اُسے ولوہ انگیز فکر چاہیے اور وہ ”اقبال“ کی ہے۔ اُسے یہ منظر رکھنا ہو گا کہ اقبال نے ایک فکر دی تھی اور پھر اُس کے گرد دنواح میں رہنے والے غریب اور ناخواندہ مسلمان کس تیزی سے طوفان بنے اور اپنا ایک مقصد حاصل کر لیا۔ نچلی ذات کے ہندو کو بہمن زادے مسلمان اقبال کو نئے سرے سے پڑھنا اور سمجھنا چاہیے۔

اقبال کا پیغام مسلمانوں پر ہی جا کر نہیں ٹھہرتا۔ اس کا پیغام ”انسان“ پر جا کر منزل مراد پاتا ہے۔ مسلمانوں کے بارے میں سمجھتا ہے کہ شامد اُس کا پیغام انسانیت وہ بہتر انداز میں لے کر آگے چل سکیں۔

بھارت کے مسلمانوں پر بھی لازم ہے کہ وہ ”ہندو اتا“ کے موجودہ اگنی و پرتوہی میزائل سے بچنا چاہتا ہے تو وہ اقبال کی سوچ و فکر کی طرف رجوع کرے۔ وہ اگنی و پرتوہی کے مقابلے میں غزنوی وغوری و با بر کا انتظار نہ کرے۔ اب جس نے اوپر اٹھنا ہے، باقی رہنا ہے تو اُسے ہندوستان کے اندر سے ہی اٹھنا ہو گا۔ ہندو آرین نسل کے ذریعے پہلے ہندوستان میں داخل ہوا اور اثرات مرتب کیے اور بیرون سے اُس کا رابطہ کٹ گیا۔ اب ہندو اسلام کو بھارت ماتا اور بھارت دھرتی قرار دیا جا رہا ہے۔ حالانکہ اسلام ہی کی طرح ہندو نمہب بھی باہر سے داخل ہوا۔ اسلام چونکہ ابھی کل کی بات ہے، اس لیے ہندو اسے پر دیکی مذہب قرار دینے کے جذبوں سے لیس اور حکمت عملی سے وابستہ نظر آتا ہے۔ مسلمان سادگی سے ہندو نمہب کے پیروکاروں کی ان آرزوؤں کو درست سمجھتے ہوئے باہر دیکھتا رہتا ہے۔ باہر دیکھنے کی یہ روشن ”ہندو اسلام“ کی عکاس ہے۔ وہ کوئی آئے گا۔ ہمیں چھڑا لے جائے گا۔ مسلمانوں کو یہ سمجھنا ہو گا کہ اس طرح کے گاؤں کا دور گزر گیا ہے۔ جب خیالی آوازوں سے عزم و حوصلے کی لہریں اٹھتی تھیں۔ اب حقائق کا دوسرا طرح کا دور ہے۔ اب جو کچھ کرنا ہو گا، خود ہی کرنا ہو گا۔ اب بھارتی مسلمان بیرونی مسلمان نہیں ہے۔ وہ بھارتی ماتا یا دھرتی کا باسی ہے۔ ہندوستان کی دھرتی کسی ایک کی میراث نہیں ہے۔ دھرتی سب انسانوں کی ہوتی ہے۔ مذہب کی بنیاد پر دھرتی ملکیت نہیں بنتی، یہ محض انسان کش خیالات ہوتے ہیں۔ اسلام کا یہی پیغام ہے۔ آپ ﷺ نے مدینہ منورہ پہنچ کر تمام مذاہب کے اشتراک سے ایک ریاست قائم کر کے ایک لازوال مثال قائم کی تھی۔

بھارت میں بننے والے مسلمانوں کو دھرتی ماتا کے سپوت ”اقبال“ کو دوبارہ اور نئے سرے سے پڑھنا اور سمجھنا ہو گا۔

مسلمانوں کی ہندوستان میں جدید تاریخ ہندوستانی دھرتی ماتا کے سپوتون نے مرتب کی ہے۔ مغلوں کے بعد انگریزوں نے قبضہ کیا تھا لیکن مسلمانوں نے باہر سے حملہ نہیں کیا ہے۔ ۱۸۵۷ء کے بعد مقامی مسلمانوں نے اپنا سفر خود طے کیا ہے گوکہ مسلمانوں کے باہر سے حملہ نہ کرنے سے ہندوستان کا مسلمان غیر محفوظ بنادیا گیا ہے؟ یہ نقطہ قابل غور ہے۔ ایک پہلو تو یہ ہے کہ ”ہندو اتا“ کی قوتیں مسلمانوں کو مٹانے کا پیغام دے کر بیرون ہندوستان پھر مسلمانوں کو دعوت دے رہی ہیں کہ تاریخ کو پھر دہراو، اس کے بغیر ہم سبق سکھنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ یاد رہے بھارت کے مسلمانوں کو جب بھی دیوار کے ساتھ لگایا گیا۔ ایسا ممکن ہو سکتا ہے؟

دوسری پہلو وہ ہے جس کا پیغام اقبال نے دیا ہے کہ اکٹھے رہنا سکھو۔ اقبال کا یہ پیغام شاہ ولی اللہ اور سید احمد خان کی اگلی کڑی کے طور پر انسانیت نواز پیغام ہے۔ ”پاکستان“ اس کا پہلا پیغام تھا اور ”اقبالستان“ اگلا پیغام ہے کہ سب مذہبی، نسلی، لسانی اقلیتوں کو اپنی اپنی علاقائی حدود میں آزاد و خود مختار بنا کر انہیں خوف و عمم سے پاک زندگی گزارنے دی جائے۔ بھارت پہلے ہی ۲۰ کے قریب ریاستوں کا قیام عمل میں لا چکا ہے۔ ان ریاستوں کو مذہبی، نسلی، اور لسانی لحاظ سے ہندو غلبے و خوف یعنی ”ہندو اتا“ سے دور کرنا ہو گا۔

عیسائی اور سکھ بھی دو بڑی مذہبی اقلیتیں ہیں۔ سکھ نسلی اور لسانی اقلیت بھی ہے۔ ہندو غلبے سے نجات کا یہ لوگ فیصلہ کر چکے ہیں۔ مگر بھارت کی وفاقی ریاست کا بھرم ابھی رکھ رہے ہیں ”ہندو اتا“، غلبہ حاصل کرنے کی کوشش جاری رہی تو سکھ مزاحمت کے ذریعے الگ ریاست حاصل کر لیں گے۔ مسلمان اور سکھ جنگجو قومیں ہیں۔ انہیں زیادہ دبانے سے بھارت خود بخود انتشار کا شکار ہو گا۔ عیسائی اور نیچلی ذات کے ہندو جنگجو نہیں ہیں۔ اسی لیے ”ہندو اتا“ قوت ان سے خوف زدہ نہیں ہے۔ بلکہ نیچلی ذات کے ہندو کو بھی ”ہندو اتا“ کے تحت مذہبی ہوادے کرائے کرے بے وقوف بنا رکھا ہے اور استعمال کر رہا ہے۔ نیچلی ذات کے ہندوؤں کو ان کے اکثریتی علاقوں میں آزاد ریاستیں مل جائیں تو اس سے ہندو ازم اور بھارت کا تو کوئی نقصان نہیں ہو گا۔ یہ ہندو ہی رہیں گے۔ بھارت میں ہی رہیں گے صرف کسی قدر شود ہندو غلبے سے باہر نکل آئیں گے۔ اور شاید درجہ انسانیت پر فائز ہو جائیں گے۔

ہندوؤں کو اکثریت میں اور مسلمانوں کو اقلیت میں ہی ہندوستان میں رہنا ہے۔ ہندوؤں کی اکثریت کو ایک ہزار سالہ مسلم حکومت نے مذہبی نقطہ نگاہ سے نہیں چھیڑا۔ اس ایک ہزار سالہ مسلم حکومت میں ہندوؤں کو نظر انداز بھی نہیں کیا گیا۔ جزوی واقعات اجتماعی نتائج پر اثر انداز نہیں

ہوتے۔ اور یہ سب کچھ تاریخ میں محفوظ ہے۔ لیکن ۱۸۵۷ء کے بعد ہندوستان کی فضاء انگریز کے زیر تسلط اکثریت اور اقلیت کے نقطہ نظر سے بد لئے گئی۔ بد لے ہوئے دور میں قوموں کی صورت حال بھی بدل جاتی ہے۔ چنانچہ ایک صدی کے اندر ہندوستان میں دونماں دو حکومتیں دو مختلف علاقوں میں قائم ہو گئیں۔ اس عرصے تک ہندوؤں کو تو معلوم تھا کہ وہ مسلم حکومت کے ساتھ کیسے چل سکتے ہیں؟ لیکن مسلمانوں کو یہ خبر نہ تھی کہ وہ ہندو حکومت کے ساتھ کیسے چل سکیں گے؟ اس بے خبری اور خوف کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ مسلمانوں نے الگ نمائندگی اور علاقے کو حاصل کرنا ضروری سمجھا۔ قیام پاکستان اور بھارت کے بعد بالکل نیا منظر سامنے آیا کہ پاکستان کے علاقوں سے ہندو ہجرت کر کے بھارت چلے گئے اور یہ علاقہ تقریباً خالی ہو گیا جبکہ بقیہ ہندوستان جو بھارت کہلایا وہاں سے مسلمان مکمل طور پر انخلانہ کر سکے اور آج بھی ایک بڑی تعداد بھارت میں مقیم ہیں۔ مسلمانوں کے بھارت میں ایک بڑی اکثریت کے رہ جانے سے پچھلے ۵۸ برسوں میں یہ سوال کئی دفعہ ابھرا کہ مسلمانوں کو ہندو اکثریت کے تحت کیسے رہنا ہے؟ یہ معاملہ ابھی تک حل نہیں ہوا۔ ہندو تنظیموں نے ”ہندو اتا“، کونصب العین قرار دے کر سب قومیوں کو ایک کل میں ڈھانے کی پالیسی اختیار کر کے مسلمانوں کو خوف زدہ بھی کیا ہے اور جارحانہ رو یہ اختیار کرنے پر مجبور بھی کیا ہے۔ اس سے یہ بات تو ظاہر ہو گئی کہ ابھی مسلمانوں اور ہندوؤں کو اپنے اپنے نماہب کی خوبصورتی کو قائم رکھتے ہوئے اکٹھے رہنے کا طریقہ نہیں آیا۔ اور پاکستان کا قیام اس مشکل کا بہترین حل تھا۔ اب بھی اگر بھارت کے اندر ہی مسلمانوں اور ہندوؤں کو اکٹھے رہنے کا کوئی کلیہ اور قاعدہ اس طرح ہاتھ نہیں آتا کہ وہ ایک دوسرے کو برداشت کرتے ہوئے اپنے اپنے عقیدے پر ہتھی ہوئے ایک بہتر سماجی زندگی بسر کر سکیں تو لامحالہ اس کا آخری حل پھر وہی نکلے گا جو پاکستان کی صورت میں نکلا تھا۔ ایک اور یا ایک سے زائد پاکستان بنیں گے۔ مسلمان پھر کسی اور علاقے میں اکٹھے ہوں گے۔ بنگلہ دیش کو پاکستان کے واقعی ڈھانچے سے الگ کرنے میں بھارت کا بڑا رول تھا۔ گجرات کے مسلمانوں کے ساتھ جو ہوا، ان کے پاس اب اس کے علاوہ کوئی چارہ کار نہیں، کہ وہ گجرات کا مسلم اکثریتی حصہ الگ انٹرنشنل شیٹ قرار دلوانے کی جدوجہد کریں جو سارے بھارت کو متاثر کرے گی۔ یہ جدوجہد شروع ہو چکی ہے اور یہ سارے بھارت کو متاثر کرے گی۔ جموں کشمیر کی صورت گو پہلے دن سے الگ ہے مگر برعظیم کا ایک حصہ تو ہے۔ اور پھر بھارت نے اپنی مرضی سے یا بیرونی اشاروں پر کشمیر کے ایک بڑے حصے پر قبضہ کر کے پورے برعظیم میں طے ہوتے سیاسی مسائل کو ایک نئی چنگاگری دے کر زندہ رکھا ہوا ہے۔ جس کا نتیجہ اگر

پاکستان کے خلاف ہے تو بھارت کے حق میں بھی نہیں گیا ہے۔ کشمیریوں کی جدوجہد سے جنوبی ہند میں بعض نسلی قومیتوں کو جدوجہد کی شہملی ہے۔ کشمیریوں کی جدوجہد سے بھارت میں دوسری مذہبی و نسلی اقلیتوں کو اپنے حقوق اور جدوجہد کا شعور و راہ ملی ہے۔

یہ سطور بھارت کی مخالفت کو مرکزی نقطہ بنانے کی غرض سے زیر تحریر نہیں ہیں۔ بلکہ سوچ کا مرکزی محور یہ ہے کہ BJP اور ہندو اتنے دوسری مذہبی اور نسلی اقلیتوں کو عدم تحفظ سے جو دو چار کر دیا ہے۔ اس کا حل ہونا ہے۔ وہ اگر اکٹھے رہنے کی صورت میں قابل عمل نہیں رہتا۔ تو پھر اسے ”اقبالستان“ کی صورت دینی ہوگی۔ یہی اس کا حل ہے۔ یہاں یہ سوال پھر پیدا ہو گا کہ بھارت اور پاکستان الگ ہوئے اور ۵۸ سالوں سے لڑ رہے ہیں۔ تو مزید آزاد ریاستوں یا اقبالستان کی صورت میں بھی صورت حال تو ایسی ہوگی۔ حکومتیں زیادہ ہو جائیں گی۔ علاقے تو وہی رہیں گے۔ اور لوگ بھی تقریباً اسی طرح رہیں گے۔ جیسے گجرات کی الگ سُنی شیعیت بھی تو گجرات میں ہو گی۔۔۔ اردوگردو تو بھارت ہو گا اور ہندو ہی ہوں گے۔ یقیناً یہ سوال اپنی جگہ اہم ہے۔ مگر اصل مسئلہ ان آنے والے تحفظات کا نہیں ہے۔ بلکہ گزرے ہوئے ۵۸ سالوں کا ناکام تجربہ ہے۔ اس تجربے کو برقرار اور جاری رکھنے کا مطلب ہی ”ہندو اتنا“ ہے یعنی باقی مذہبی اقلیتیں اور نسلیں مغم ہو کر فنا ہو جائیں۔ یہ سوال پھر اپنی جگہ رہتا ہے کہ مذہبی اقلیتیں اور نسلیں کتنا مغم بھی ہو جائیں تو کیا انہیں ہندوؤں کی اکثریت انہیں اپنے جیسا تسلیم کر لے گی۔ ”ہندو اتنا“ قبول کر کے بھی اقلیتیں، اقلیتیں رہیں گی۔ اس لیے آگے بڑھنا پہلی شرط ہے۔ اگلا تجربہ ضروری ہے۔ جو موجود ہے وہ ناکام ہے۔ آگے بڑھنے سے اکٹھے رہنے کا بل آئے گا۔ اس کی بہترین مثال یورپ ہے۔ جو تقسیم ہو کر الگ سے رہنے کے طریقے سیکھ کر، اپنی حیثیت کو جدا کر کر اپنی افرادیت کو پختہ بنایا کر اب دوبارہ اکٹھے رہنے کا تجربہ کئی محاذوں پر کرنے چلا ہے۔ ضروری نہیں یہ آخری اکٹھے رہنے کا کوئی فلسفہ ہو۔ مگر یہ ایک طریقہ ہے کہ ایک تجربے سے گزر کر انسانوں کو اکٹھے رہنے کا کلیہ دیا جا رہا ہے۔

اقبالستان، پاکستان کی تعبیر نو

افکار کے جنم لینے کے پچھے ایک طویل تاریخی سفر، چونکا دینے والے واقعات، خوف دلانے والے حادثات اور پھر ڈوب کر غور و فکر کا عمل پہاں ہوتا ہے۔ اپنوں کی تاریخی غلطیاں، مخالفوں کی دشمنانہ چاکدستیاں اور زندہ لوگوں کی مردہ حرکتیں افکار کی لڑیاں اور زنجیریں بنانے میں معاون ثابت ہوتی ہیں۔ جب آپ کی ہستی کو مٹ جانے اور آگے بڑھنے سے روکنے کا خطرہ درپیش ہوتا ہے تو وہ بلا سبب نہیں ہوتا۔ ایک سبب وہ تسلسل ہوتا ہے جس میں ماضی کی تاریخی غلطیاں بنیاد بنا جاتی ہیں۔ دشمن ان کو سرگرمیوں کا محور بنالیتا ہے۔ قوم جوش و جدوجہد سے عاری ہو کر مردہ حرکتیں کرنے لگتی ہے۔ یوں مٹنے کا تسلسل شروع ہو جاتا ہے۔ ان سطور میں ”ہندوata“ کے حوالے سے تازہ صورتحال کا تجزیہ اس طرح مطلوب ہے کہ ”پاکستان سے اقبالستان تک“ کی فکر اس کا منطقی نتیجہ معلوم ہو۔ اس کی بنیاد محمد علی جناح کے نام اقبال کا یہ خط ہے۔

لاہور ۲ جون ۱۹۳۷ء (بصیغہ راز)

”محترم جناح صاحب“

کل آپ کا نوازش نامہ ملا، بہت شکریہ! میں جانتا ہوں کہ آپ بہت مصروف آدمی ہیں مگر مجھے توقع ہے کہ میرے بار بار خط لکھنے کو آپ بار خاطر نہ خیال کریں گے۔ اس وقت جو طوفان شمال مغربی ہندوستان اور شاید پورے ہندوستان میں برپا ہونے والا ہے، اس میں صرف آپ ہی کی ذات گرامی سے قوم محفوظ رہنمائی کی توقع کا حق رکھتی ہے۔ میں عرض کرتا ہوں کہ ہم فی الحقیقت خانہ جنگی کی حالت ہی میں ہیں۔ اگر فوج اور پولیس نہ ہو تو یہ (خانہ جنگی) دیکھتے ہی دیکھتے پھیل جائے۔ گذشتہ چند ماہ سے ہندو مسلم فسادات کا ایک سلسلہ قائم ہو چکا ہے۔ صرف شمال مغربی ہندوستان میں گذشتہ تین ماہ میں کم از کم چار

واردات میں ہندوؤں اور سکھوں کی طرف سے تو ہیں رسالت کی ہو چکی ہیں۔ ان چاروں مواقع پر رسول ﷺ کی اہانت کرنے والوں کو قتل کر دیا گیا ہے۔ سندھ میں قرآن مجید کو نذر آتش کرنے کے واقعات بھی پیش آئے ہیں۔ میں نے تمام صورت حال کا اچھی طرح سے جائزہ لیا ہے اور مجھے یقین ہے کہ ان حالات کے اسباب نہ مذہبی ہیں نہ اقتصادی، بلکہ خالص سیاسی ہیں۔ یعنی مسلم اکثریتی صوبوں میں بھی ہندوؤں اور سکھوں کا مقصد مسلمانوں پر خوف و ہراس طاری کرنا ہے۔ نیا دستور کچھ اس قسم کا ہے کہ مسلم اکثریتی صوبوں میں بھی مسلمانوں کو غیر مسلموں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مسلم وزارتمیں کوئی مناسب کارروائی نہیں کر سکتیں۔ بلکہ انہیں خود مسلمانوں سے نا انصافی برتنا پڑتی ہے تاکہ وہ لوگ جن پر وزارت کا انحصار ہے، خوش رہ سکیں اور ظاہر کیا جا سکے کہ وزارت قطعی طور پر غیر جانبدار ہے۔ لہذا یہ واضح ہے کہ ہمارے پاس اس دستور کو رد کرنے کے خاص طور پر وجود موجود ہیں۔ مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نیا دستور ہندوؤں کی خوشنودی کے لیے وضع کیا گیا ہے۔ ہندو اکثریتی صوبوں میں ہندوؤں کو قطعی اکثریت حاصل ہے اور وہ مسلمانوں کو بالکل نظر انداز کر سکتے ہیں۔ مسلم اکثریتی صوبوں میں مسلمانوں کو کاملاً ہندوؤں پر انحصار کرنے کے لیے مجبور کر دیا گیا ہے۔ میرے ذہن میں ذرا بھی شک و شبہ نہیں کہ یہ دستور ہندوستانی مسلمانوں کو ناقابل تلافی نقصان پہنچانے کے لیے بنایا گیا ہے۔ علاوہ ازیں یہ اقتصادی مسئلہ کا بھی حل نہیں ہے جو مسلمانوں کیلئے بہت زیادہ جانکاری بن چکا ہے۔

کیمیول ایوارڈ ہندوستان میں مسلمانوں کے سیاسی وجود کو صرف تعلیم کرتا ہے لیکن کسی قوم کے سیاسی وجود کا ایسا اعتراف جو اس کی اقتصادی پس ماندگی کا کوئی حل تجویز نہ کرتا ہو اور نہ کر سکے، اس کے لیے بے سود ہے۔ کامگریں کے صدر نے تو غیر مہم الفاظ میں مسلمانوں کے (جداگانہ) سیاسی وجود سے ہی انکار کر دیا ہے۔ ہندوؤں کی دوسری جماعت یعنی مہا سماج نے جسے میں ہندو عوام کی حقیقی نمائندہ سمجھتا ہوں، بارہا اعلان کیا ہے کہ ہندوستان میں ایک متحده ہندو مسلم قوم کا وجود ناممکن ہے۔ ان حالات کے پیش نظر بدیہی حل یہ ہے کہ ہندوستان میں قیام امن کے لیے ملک کی از سر نو ترقیم کی جائے جس کی بنیاد نسلی، مذہبی اور اسلامی اشتراک پر ہو۔ بہت سے برطانوی مدرسین بھی ایسا ہی محسوس کرتے ہیں اور اس دستور کے جلو میں جو ہندو مسلم فضادات چلے آ رہے ہیں، وہ ان کی آنکھیں کھولنے کے لیے کافی ہیں کہ ملک کی حقیقی صورت حال کیا ہے؟ مجھے یاد ہے کہ انگلستان کے انگلستان سے روائی سے قبل لارڈ لوٹھیان نے مجھے کہا تھا کہ میری سیم میں ہندوستان

کے مصائب کا واحد ممکن حل ہے، لیکن اس پر عملدرآمد کے لیے ۲۵ سال درکار ہیں۔ پنجاب کے کچھ مسلمان شمال مغربی ہندوستان میں مسلم کانفرنس کے انعقاد کی تجویز پیش کر رہے ہیں اور یہ تجویز تیزی سے مقبولیت اختیار کر رہی ہے۔ مجھے آپ سے اتفاق ہے کہ ہماری قوم ابھی اتنی زیادہ منظم نہیں ہوئی اور نہ ہی ان میں اتنا نظم و ضبط ہے اور شاید ایسی کانفرنس کے انعقاد کا ابھی موزوں وقت بھی نہیں لیکن میں محسوس کرتا ہوں کہ آپ کو اپنے خطبہ میں کم از کم اس طریق عمل کی طرف اشارہ ضرور کر دینا چاہیے جو شمال مغربی ہندوستان کے مسلمانوں کو بالآخر اختیار کرنا پڑے گا۔

میرے خیال میں تو نئے دستور میں ہندوستان بھر کو ایک نئی وفاق میں مربوط رکھنے کی تجویز بالکل بے کار ہے۔ مسلم صوبوں کے ایک جدا گانہ وفاق کا قیام اس طریق پر جس کا میں نے اوپر ذکر کیا ہے صرف واحد راستہ ہے جس سے ہندوستان میں امن و امان قائم ہو گا اور مسلمانوں کو غیر مسلموں کے غلبہ سلطے سے بچایا جاسکے گا۔ کیوں نہ شمال مغربی ہندوستان اور بنگال کے مسلمانوں کو علیحدہ اقوام تصور کیا جائے جنہیں ہندوستان اور بیرون ہندوستان کی دوسری اقوام کی طرح حق خود اختیاری حاصل ہو۔

ذاتی طور پر میرا خیال ہے کہ شمال مغربی ہندوستان اور بنگال کے مسلمانوں کو فی الحال مسلم اقلیت کے صوبوں کو نظر انداز کر دینا چاہیے۔ مسلم اکثریت اور مسلم اقلیت کے صوبوں کا بہترین مفاد اسی طریق کو اختیار کرنے میں ہے۔ اس لیے مسلم لیگ کا آئندہ اجلاس کسی مسلم اقلیت کے صوبہ کی بجائے پنجاب میں منعقد کرنا بہتر ہو گا۔ لاہور میں اگست کا مہینہ تکلیف دہ ہوتا ہے۔ میرے خیال میں آپ لاہور میں وسط اکتوبر میں جب موسم خوشگوار ہو جاتا ہے مسلم لیگ کے اجلاس کے انعقاد کے بارے میں غور فرمائیں۔ پنجاب میں آل ائمہ یا مسلم لیگ سے دچپی بڑی تیزی کے ساتھ بڑھ رہی ہے اور لاہور میں مسلم لیگ کے آئندہ اجلاس کا انعقاد پنجاب کے مسلمانوں میں ایک نئی سیاسی بیداری کا باعث ہو گا۔

آپ کا ملخص:- محمد اقبال بارائیٹ لاء

اقبال کا یہ خط قائد اعظم محمد علی جناح کے نام ہے اور صیغہ راز میں رکھنے کی استدعا ہے۔ خطبہ الہ آباد الگ سے زیر بحث آیا ہے۔ وہ باقاعدہ اور سیاسی لحاظ سے ایک منظم گروہ کے فورم سے قوم کی رہنمائی کے نقطہ نظر سے ہے۔ اس خطبہ میں ایک سمت اور حکمت عملی کا باقاعدہ تعین کیا گیا ہے۔

اقبال نے متعدد خطوط محمد علی جناح اور دوسرے صاحب فکر و عمل قائدین کو لکھے ہیں۔ یہ ان کی وفات سے ایک سال پہلے کا خط ہے۔ صورت حال کا تجزیہ اس وقت کا بھی تھا اور اس خط سے جو صورت حال سامنے آتی ہے اسے آج کے ناظر میں بھی دیکھا جانا چاہیے ہے۔

- انہوں نے مسلمانوں پر آنے والے طوفان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے خانہ جنگی اور توہین رسالت کے واقعات اور ان کے رد عمل کو بیان کیا ہے اور واضح طور پر ان واقعات کو مذہبی یا اقتصادی کے بجائے سیاسی قرار دیا۔

- ان سیاسی واقعات کے مقاصد کی وضاحت کرتے ہوئے انہیں مسلم اکثریتی صوبوں میں مسلمانوں کو خوفزدہ کرنے کے عمل سے تعبیر کیا ہے۔ خوف عمل سے روکتا ہے اس لیے ایسی فضا ہمیشہ دشمن کے حق میں جاتی ہے۔

- دستور جو بنایا گیا ہے مسلمانوں کے خلاف ہندوؤں کو کلی اختیارات تفویض کرتا ہے، جو لامحالہ غلط استعمال کریں گے۔

- قوم کے سیاسی وجود کو اس کے اقتصادی انصاف کے بغیر تسلیم کرنا بے معنی ہے۔ کانگریس مسلمانوں کے (جدا گانہ) سیاسی وجود سے مکمل انکاری ہے۔

- ہندو مہا سبھا ہندوؤں کی حقیقی نمائندہ جماعت ہے جو مسلمانوں کے علیحدہ وجود کو تسلیم کرنے کے لیے کسی طور پر تیار نہیں ہے۔

- یہ حالات تقاضا کرتے ہیں کہ ہندوستان میں قیام امن کے مقصد کو حاصل کرنے کے لیے نسلی، مذہبی اور لسانی بنیاد پر علاقوں کو تقسیم کر دیا جائے۔

- اسی تجویز کے تحت شمال مغربی ہندوستان (موجودہ پاکستان) اور بنگال (موجودہ بنگلہ دیش) کو مسلمانوں کی دوالگ الگ قومیں تسلیم کرنے کا تصور دیا۔ (اس کی روشنی میں قیام بنگلہ دیش کو بھی دیکھا جاسکتا ہے)۔

- مسلم اکثریت کے صوبوں کے علاوہ مسلم اقلیت کے صوبوں کو اس مرحلے پر نظر انداز کرنے کا مشورہ دیا۔ اور کنو شن بھی مسلم اکثریتی صوبے پنجاب میں منعقد کرنے کا مشورہ دیا۔

ہندو اتنا فکر کے نقطہ نظر سے

اس ضمن میں قائد اعظم محمد علی جناح کے نزدیک ہندوستان میں مسلمانوں کے لیے اصل مسئلہ آزاد ہند میں مسلمانوں کی آزادی تھا، جہاں وہ اپنے مذہب، ثقافت، زبان اور سیاسی حقوق کی حفاظت کر سکیں۔ ایک حکومت جہاں اکثریت اور اقلیت کے تعلقات سخت کشیدہ ہوں گے، وہاں اقلیت کا عدم تحفظ کا شکار ہونا فطری عمل ہے۔ قائد اعظم نے آل انڈیا مسلم شوؤمنس فیڈریشن کانفرنس کلکتہ میں ۲۸ دسمبر ۱۹۳۷ء کو خطاب کے دوران اس پروشنی ڈالتے ہوئے کہا۔

”ہند میں جو طرز حکومت انہوں نے (انگریزوں) راجح کیا ہوا ہے، وہ جمہوری پارلیمانی طرز حکومت ہے جوان آقاوں، انگریزوں کے دلیں میں راجح ہے۔ اگر وہ حکومت کام کر سکتی ہے تو وہ اکثریت کی بنیاد پر ہی کام کر سکتی ہے اور وہ جانتے ہیں کہ ہند میں ہندو اکثریت میں ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ ہندو کسی اور انسان سے مختلف ہے لیکن انسانی فطرت جو بھی ہے، اپنے تجربہ پر کہہ سکتا ہوں کہ اکثریت متکبر اور ظالم ہو سکتی ہے اور ممکن ہے کہ وہ اقلیت پر کاٹھی ڈال دے۔“

مذہبی عصر کی موجودگی کی طرف احساس دلاتے ہوئے مزید کہا کہ

مذہب ایک اہم عصر ہے۔ جب تک کہ وہ خاص ثقافت، فلسفہ حیات اور معاشرتی زندگی میں پروان چڑھے ہوں اور اگر اس خصوصی مذہب کے لوگ حکومت بنائیں تو یہ ایک قدرتی بات ہے کہ وہ حکومت پر اثر انداز ہونے کی کوشش کریں گے۔ اپنی ثقافت اور فلسفہ حیات کو مسلط کرنے کی کوشش کریں گے۔ اس محدود اختیارات کی دلیل سے جس پر انہیں قدرت حاصل ہوگی۔ ہمارے پہلے ہی سے اس کا ثبوت ”بندے ماترم“ گانے اور ہندی ہندوستانی کولازمی طور پر پڑھانے کی شکل میں موجود ہے۔ اپنی کامیابی کے نشہ میں انہیں اس کا احساس تک نہ ہو سکا کہ ایسے لوگ بھی ہو سکتے ہیں جو اسے وحشیانہ انداز سے تعبیر کریں گے۔

کانگریس کی اپنی ایک مخصوص سیاسی لغت ہے جس کے مطابق "قوم پرستی" کے معنی ہیں "ہندو پرستی" اور "سوراج" کا مطلب ہے "ہندو راج" دستور کو ملیا میٹ کرنے کا مطلب ہے دستور کو "چلانا" اس طرح کانگریس کی لغت میں آزادی کے معنی ہیں ہندو کی آزادی اور مسلمانوں اور دیگر اقلیتوں اور کمزور لوگوں کی غلامی۔

مسلمان متحده ہوئے تو انہیں غلام بنالیا جائے گا۔ وہ ہندو کی آزادی حاصل کر لینے کے خلاف نہیں لیکن انہیں یہ دیکھنا ہو گا کہ نہ صرف ہندوؤں کو آزادی ملے بلکہ مسلمانوں کو بھی، مسٹرجناح نے کہا کہ "لیگ واضح کر دینا چاہتی ہے کہ مسلمان ہندوؤں کے محض خیمه بردار نہیں گے۔ وہ چاہتی ہے کہ آزاد ہند میں آزاد مسلمان ہوں۔

ہمیں قطعی اور موثر تحفظ مطلوب ہے اور ایسے موثر ہتھیار جن کے ذریعے سے نہ صرف ہم اپنے مذہب، ثقافت اور زبان کی حفاظت کر سکیں بلکہ اپنے سیاسی حقوق کی بھی اور ملک کی حکومت اور انتظامیہ میں بھی اپنی جگہ اور پوزیشن کو برقرار رکھ سکیں۔

اقبال کی فکر اور جناح کے عمل کا نتیجہ "پاکستان" ہے۔ یہ دونوں مسلم رہنماء مسلم ہندو اتحاد کے تصور سے اپنے فکری اور عملی سفر کا آغاز کرتے ہیں مگر سیاسی طور پر تبدیل شدہ حالات، انگریزوں کے انداز حکمرانی اور ہندوؤں کی اکثریتی قوت سے ابھرتے عزم کے ماحول میں ان مسلم رہنماؤں کی بصیرت نے تصورات و نظریات کے پرچار کے بجائے نئی حقیقوں کو قبول کرنا ضروری سمجھا۔ گذشتہ سطور میں اقبال کے ایک خط اور محمد علی جناح کے چند بیانات سے یہ بتانا مقصود ہے کہ ان کی بصیرت نے جو کل دیکھا اور محسوس کیا تھا، دنیا وہ آج دیکھ اور محسوس کر رہی ہے۔ وقت اور فاسلوں نے ان رہنماؤں کی علیحدہ مسلم اپروپریوچ کو حج ثابت کیا ہے۔

جدید مضھیں اور "ہندو اتا" اگلی سطور میں تازہ لکھنے والوں کے تجزیوں کی بنیاد پر تازہ ہندو عزم کی حقیقت کو بیان کر کے ماضی کے ان اہل بصیرت قائدین کی فکر کو مزید اجاگر کیا جائے گا۔ پروفیسر I.N.Talbot کوونٹری یونیورسٹی برطانیہ میں بھارت و پاکستان پر پڑھاتے ہیں اور لکھتے بھی ہیں۔ انہوں نے اس موضوع پر تفصیل لکھا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ

ساوا رکنے ہندو قومیت (ہندو اتا) کی بنیاد مذہبی تفریق کے بجائے فرقہ دارانہ تہذیب اور تاریخی کرداریت پر رکھی۔ ہندو ازم کوئی کا حقیقی وارث اور ویدک دور کو سنہری ہندوانہ دور قرار دیا۔ ہندو اتا کی بنیاد ویدک دور قرار دیا۔ سنکرت زبان کو تمام زبانوں کی ماں قرار دیا۔ مسلمانوں اور

عیسائیوں کو بیرونی عناصر قرار دیا اور یہ باور کرایا کہ ہندوستان ان کی مقدس سرزمین نہیں ہے جبکہ بھارتی ریاست کا مستقبل ہندو قومیت سے مسلک ہے جس کا ماضی اس سرزمین سے وابستہ ہے جبکہ Golwakar جمنی کے نازی ازم سے متاثر ہو کر ہند پھر روایت میں آریانیل کے حوالے سے ایک ہونے کا ذکر کرتا ہے۔ وہ ہندو اتنا کوتار نخ اور سنسکرت زبان کا نتیجہ قرار دیتا ہے۔ ہندو قوم کو بھارت Bharat کہتا ہے۔

غیر ہندو اقوام کو اس تصور قومیت کے تحت الگ پیش کیا گیا۔ البتہ یہ تر غیب دی گئی کہ دوسری اقوام مسلمان، عیسائی، بدھ اور سکھ اپنی تہذیب و ثقافت سے دستبردار ہو جائیں۔ یہی وجہ ہے کہ Golwakar کے ان افکار کے بعد ہندو قومیت کے علمبردار مسلمانوں، عیسائیوں، بدھوؤں اور سکھوں پر مسلسل دباؤ ڈال رہے ہیں کہ وہ اپنی شناخت سے دستبردار ہو کر مرکزی دھارے میں شامل ہو جائیں۔ ۵

گوانکر (Golwakar) We Our Nationhood Defend میں ہندو قومیت کے عناصر ترکیبی بیان کرتا ہے۔ یہی گوانکر ”ہندو اتنا“ کا ساوار کر کے بعد نظریاتی رہنماء ہے۔ (اور خشونت سنگھ نے اپنی ملاقات میں اس آدمی کی سیاسی حکمت عملی کی نشاندہی بھی کی ہے)۔ اس نے قومیت کی عمومی تعریفوں کے بعد ہندو قومیت کے لیے

۱۔ جغرافیائی اکائی۔ ۲۔ نسلی اکائی۔ ۳۔ مذهبی اکائی۔
۴۔ تہذیبی اکائی۔ ۵۔ زبان کی اکائی کو لازمی قرار دیا ہے۔

اکائی کے اس تصور میں مسلمانوں، عیسائیوں، سکھوں، تامل، آسامی اور دوسری اقلیتوں اور چھوٹی ذات کے ہندوؤں کے لیے اس کے علاوہ کوئی چارہ کار یا راستہ نہیں کہ وہ ہندو قومیت یعنی ہندو اتنا میں مدد و ضم ہو جائیں یا ہندوستان چھوڑ جائیں۔ وہ لکھتا ہے،

تمام (غیر ہندو) کو ہر حالت میں ہندو تہذیب اور زبان اپنانی ہوگی۔ ہر حالت میں ہندو مذہب اور اس کے تقدس کو اپنانا ہوگا۔ ہر حالت میں ہندو نسل اور تہذیب کی عظمت کو اجاگر کرنا ہوگا۔ بصورت دیگر تمام (غیر ہندو) کو ہندو قوم کی مکمل غلامی اختیار کرنی ہوگی اور کسی قسم کے تربیحی سلوک اور رعایت کی مانگ نہیں کی جائے گی یہاں تک کہ شہری حقوق کے متحق بھی نہ ہوں گے۔ ۶
اما بھارتی (Uma Bharati) ایک سرگرم خاتون نے ۱۹۹۱ء میں ایک آڈیو شیپ جاری کی جو ہندوستان بھر میں تقسیم کی گئی۔ اس نے کہا۔

بغیر کسی لگی لپٹی کے یہ اعلان کیا جائے کہ یہ ہندو قوم ہے، ہندوؤں کی قوم ہے۔ ہمیں ہندو قومیت کو ہر حال میں ایک دائرے میں لانا ہے۔ دشمنوں کے لیے محبت کی کوئی گنجائش نہیں..... (قرآنی تعلیمات کے حوالے سے نامناسب الفاظ)..... ہم ان کو لفظوں میں نہیں سمجھا سکتے۔ اب وقت آگیا ہے کہ ہم لا توں سے ان کو سمجھا میں۔ اپنی مذہبیت اور رحم دلی کو کنارے رکھو اور ان کو جنمیں پھینک دو۔ جو کوئی غیر ہندو کے طور پر یہاں رہے گا، ہمارے رحم و کرم پر ہو گا۔^۵

بالٹھا کرے نے ۱۱ اکتوبر ۱۹۹۸ء کو ”اعدیں ایکسپریس“ میں کہا

ایک ہندوستانی کے ناطے صرف یہی بات اہم نہیں کہ ہمارے ملکی قوانین پر قائم رہا جائے بلکہ اہم بات یہ ہے کہ جس طرح ہم رہتے ہیں، اس طریقے پر سب رہیں۔ ہماری تہذیب کو قبول کریں اور ہماری سچائیوں کی عزت کریں۔ صرف یہیں بلکہ ہندو اسلام کو اپنا میں۔ جس کو اس ملک کی اکثریت نے اپنارکھا ہے اور جو لوگ ایسا کرنے سے انکار کرتے ہیں، انہیں اس ملک میں رہنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ جو ”ہندو اتا“ کے بارے میں مخالفانہ عزادم رکھتے ہیں یا تنقید کرتے ہیں ان کو معاف نہیں کیا جائے گا۔ پورے ہندوستان کو ہندو مناسبت سے قبول کرو یا اسے چھوڑ دو۔^۶

اکبرالیس احمد نے اس موضوع پر مفید بحث کی ہے اور ”ہندو اتا“ کو پوری طرح سامنے لانے کی کوشش کی ہے۔

ان کے مطابق بنیکم چتر جی Anandamath Backim Chiterji نے لکھی جس نے وندے ماترم اور دھرتی ماں کی فکر دی جب کہ تلک نے گان پتی میلہ (Ganpati Festivals) منعقد کیے (جس میں تربیت دی گئی) اور BJP اور اس کے لیڈر ایل کے ایڈوانی نے ایودھیا مسجد کو گرانے کے لیے مہم چلائی اور تھہ یا ترا (مارچ) کی۔ گواکرنے نے ۱۹۳۹ء میں اور پھر بالٹھا کرے نے ہٹلر کی اس پالیسی کی حمایت کی جو اس نے یہودیوں کے ساتھ روارکھی اور اسے مسلمانوں کے لیے استعمال کرنے کو حق بجانب قرار دیا۔ سو ہندو اتا تصور کے اس پوزیشن پر آنے میں ایک صدی لگی۔ Anandamath اور ایودھیا مسجد کے گرانے میں بڑا گہرا اعلقہ ہے۔ جو شیخ ۱۸۸۰ء میں بویا گیا وہ ۱۹۸۰ء میں جوان ہو کر سامنے آ گیا۔ ۱۹۲۰ء میں RSS کی سرکردگی میں ہندو مسلم فسادات شروع ہو گئے تھے۔ ۱۹۳۰ء اور ۱۹۴۰ء کے عشروں میں کئی جگہوں پر مسلمانوں کا قتل عام ہوا۔ خصوصاً شمالی ہند اور بنگال زیادہ تر اس کا شکار ہوئے۔

سرکاری اعداد و شمار کے مطابق بھارت میں آزاد ریاست کے قیام کے بعد مسلم ہندو

فسادات کی رفتار مسلسل آضافہ ہوتا رہا۔ یہ فسادات ۱۹۶۳-۱۹۵۲ کے دس سالہ عرصے میں سالانہ ۶۲ ہوتے اور تناسب ۳۰ افراد کی موت کا رہا۔ پھر ۱۹۷۰-۱۹۶۳ کے عرصے میں یکدم اضافہ ہو کر ۳۲۵ سالانہ فسادات اور مرنے والوں کی تعداد ۳۶ ہو گئی۔ ۱۹۷۸-۱۹۷۱ میں قدرے کی آئی مگر ۱۹۷۹ء کے بعد یہ تعداد ۲۰۰ تک سالانہ چلی گئی۔ اکبرالیس احمد نے بھی تصدیق کی ہے کہ BJP اور دوسری جماعتوں کے تحت باہر کی اولاد قبرستان یا پاکستان، ایسے نظرے مسلمانوں کے حوالے سے ایک خاص سیاسی راہ عمل متعین کرتے ہیں۔ یہ فقرے ایک سیاسی فلاسفی پر منجھ ہوتے ہیں جن کا مطبع نظریہ ہے کہ مسلمانوں کو باہر کی اولاد اور حملہ اور کراپیا جائے اور موجودہ مسلمانوں کو ماضی میں مسلمانوں کی برابریت، حملہ آور اور جارح کی علامت قرار دے کر مطعون کیا جائے۔

دسمبر ۱۹۹۲ء کو معمولی طور پر قانون کی دھیان نہیں بکھیری گئیں۔ رਾਹ یا تراکی تیاری اور سفر کئی دن جاری رہا اور پھر دنیا نے الیکٹر نک میڈیا پر اس کا پورا منظرو دیکھا کہ پورے ہندوستان میں کس طرح اس کے ساتھ اظہار یجھتی ہوا۔ حکومت نے آنکھیں کیے بند رکھیں اور بھارت کے طول و عرض میں مسلمانوں کے خلاف نفرت آمیز فسادات ہوئے۔ ہزاروں مسلمان قتل ہوئے، کئی عورتیں بے آبرو کی گئیں اور جنہوں نے بظاہر مسلمانوں کا حلیہ نہیں اپنایا ہوا تھا ان کی عضویاتی تحقیق کی گئی اور مسلمان ثابت ہونے پر انہیں چھڑا گھونپ دیا گیا۔ خصوصاً بمبئی میں اس طرح کے واقعات زیادہ ہوئے۔

اکبرالیس احمد نے بھارت میں مسلمانوں کے خلاف فرقہ وارانہ تشدد اور مسلمانوں کو مٹانے کے لیے خاموش اور جارحانہ دونوں انداز کی نشاندہی کی ہے۔ خصوصاً اکیڈمک انداز سے ہندو مصنفین اور انڈین مسلم مصنفین کے حوالے سے بیان کیا ہے۔ ان میں Basu کی کتاب خاکی قمیض اور زعفرانی جہنڈا اور دلت مصنف V.T.Rajshakar کی کتاب India's Muslim problems کا خصوصی تذکرہ کیا ہے۔ اس کے بعد بھارتی مسلمانوں کی کتابوں کا خصوصی حوالہ بھی دیا ہے جس میں رشید الدین خان، اقبال مسعود، سید شہاب الدین اور عمر خالدی کے نام شامل ہیں۔ سید شہاب الدین ممبر پارلیمنٹ اس موضوع پر لکھتے ہیں:-

مسلم آبادی اس نتیجے پر پہنچی ہے کہ ایک پبلو سے یادو سے پہلو سے ان کی مذہبی آزادی کو دبایا جا رہا ہے۔ مساجد کے لیے زمین نہیں دی جا رہی ہے۔ ان کی تعمیر میں رکاوٹیں ڈالی جا رہی ہیں۔ یہاں تک کہ ان کی مرمت کو سازش یا بیرودی آمدن سے جوڑا جا رہا ہے۔ اذان کو لوگوں کے لیے

ناقابل عمل قرار دیا جا رہا ہے۔ مساجد کو انتظامیہ تالے گادیتی ہے کیونکہ یہ مقامی لوگوں کا مطالبہ ہوتا ہے کہ یہاں پہلے مندرجہ ہوتا تھا۔ اسلام کو قبول کرنے والوں پر سخت نظر رکھی جاتی ہے حالانکہ عقیدے کی آزادی انسان کا بنیادی حق ہے۔ یہ سب چیزیں مسلمانوں کے ذہنوں پر اثرات مرتب کر رہی ہیں کہ انہیں مذہبی مساوات حاصل نہیں ہے۔

شہاب الدین کی زیر سر کردگی نکلنے والے جرنل "مسلم انڈیا" میں ایودھیا میں بابری مسجد کے رد عمل میں برباد ہونے والے فسادات کی ہولناک منظر کشی کی گئی ہے۔ چند واقعات کو اکبر ایس احمد نے اپنی کتاب جناح، پاکستان اور اسلامی شناخت میں نقل کیا ہے جس میں ایک ۱۹۴۷ء مسلم لڑکی کے بھائی کو اس کی آنکھوں کے سامنے چھراً گھونپا اور پھر اسے زندہ جلایا اور لڑکی کی اجتماعی آبروریزی کی، جسے ہسپتال داخل کرایا گیا اور ہسپتال نے تصدیق کی جبکہ دوسرے ایک واقعہ میں ظفر سلیم پیشل محسٹریٹ کو پولیس کی سر کردگی میں حاضر ڈیوٹی تشدید کا نشانہ بنایا گیا اور اسے کہا گیا کہ جاؤ پاکستان اور سعودی عرب سے ہتھیار لاوا اور لڑوا۔

شہاب الدین نے اس ساری صورتحال کا تجزیہ ان الفاظ میں بیان کیا۔

Perhaps the Hindu and Muslim communities are in some ways further apart to day than they were in 1947. The Hindu society is a closed society; the muslims 'mohala' is a cultural ghetto. Both communities live apart in a world of stereo types, of make believe.

سدھیر کا کرد (Sudhir Kakar) لکھتا ہے:

مسلمانوں کے حوالے سے ہندوؤں کے ہاں تین مکاتب فکر پائے جاتے ہیں۔ ان میں لبرل اور باعث میں بازو سے تعلق رکھنے والے یہ بیان کرتے ہیں کہ ہندو اور مسلمان فطری اتحادی اور ہمسائے ہیں۔ انہیں برطانیہ نے آکر تقسیم کیا اور حکومت کرنے کے راستے بنائے اور یہ ملکی تقسیم بھی انہی کی وجہ سے ہوئی ہے۔ پھر مذہبی رنگ غالب آنے سے انتشار میں مزید اضافہ ہوا۔

دوسری طبقہ اس بات پر زور دیتا ہے کہ معاشرہ جو اور جیسے ہے اسے اختلافات کو تسلیم کرتے اور ایک دوسرے کا احترام کرتے ہوئے برقرار رہنا چاہیے۔ محمد علی جناح نے اتحاد کی بھرپور کوشش کی مگر ممکن نہ ہونے پر الگ شناخت پر زور دیا۔

جبکہ تیسرا طبقہ موجودہ ہندو قومیت کا علمبردار طبقہ ہے۔ ان کی دلیل اور منطق بڑی واضح ہے کہ مسلمانوں کو ہندو اکثریتی قومیت میں معہ ذات برادری کو اختیار کر لینا چاہیے۔ الگ مسلم

شاخت ایک جرم ہے۔ وہ ایسی معاشرت قبول نہیں کریں گے۔ مسلمانوں کو اگر بھارت میں رہنا ہے تو انہیں ہندو بننا ہو گا۔“

اصغر علی انجینئر نے ہندوؤں کی مسلمانوں کی مخالفت میں چند جو ہات کی نشاندہی کی ہے کہ ہندوؤں کو باور کرایا گیا کہ مسلمانوں کے اقتدار میں ہندو تہذیب کو بر باد کیا گیا ہے۔ دوسرا مسلمانوں نے آزادی کی جدوجہد کے دوران علیحدگی کے لیے کامیابی حاصل کی۔ جدید تبدیلی کو قبول کرنے سے انکار کیا ہے اور خاندانی منصوبہ بندی جیسے سول قوانین کو مسترد کر دیا ہے۔ اس کے علاوہ ان کی وفاداریاں اپنی زمین سے باہر ہمیشہ زیادہ رہی ہیں۔

کانگریس کا قیام اور سرگرمیاں، آناداما تھے، گن پتی میلے، آریاسماج مومن، پہلی جنگ عظیم کے بعد گاندھی کا ابھرنا، ہندو فرقہ پرست جماعتوں کا ظہور جیسے مہا سبھا اور آرائیں ایس۔ یہ سب ایک ہندو شخص کے ساتھ بھارت کے تصور کو اجاگر کر رہے ہیں..... مگر ۱۹۸۰ء کے بعد ایک آفی ہندو شعور کو پروان ملی۔ ٹی وی، وی سی آر اور انٹرنیٹ نے تاریخ میں پہلی دفعہ ہندوؤں میں ایک ہونے کا احساس پیدا کیا۔

۱۹۸۰ء کے عشرے میں مہا بھارت اور رامایانا Ramayana دو معروف ڈرامے ٹیلی کاست ہوئے جنہوں نے ہندوؤں کو ماضی میں بھیج کر ایک قومی و رہنمائی تصور کو ابھارا۔ کروڑوں آدمیوں نے اسے دیکھا اور پھر اس سے فرقہ پرست جذبات کو تسلیم پہنچائی۔ رام اور ایودھیا کے تازع کو تقویت دی گئی۔ فلم اور ڈراموں کے ہیروز کو کانگریس اور بی جے پی دونوں نے انتخابی نکٹ دیئے اور اپنے جلسوں میں بلوایا۔ ॥

مہاتما گاندھی۔۔۔ ہندو اتنا افکار کے آئینے میں

مہاتما گاندھی ایک ایسی بڑی شخصیت تھی جس نے ہندوستان کے سیاسی و مذہبی منظر پر ایک گہرا اثر ڈالا۔ مسلمانوں کو یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ وہ ہندوؤں کے رہنماء تھے اور روایتی ہندوؤں ہی کی طرح تاریخ کا تجزیہ کرتے تھے۔ جیسے پروفیسر بھیکو پار Bhikupar^{۱۲} نے ان کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ ہندوستان کی تاریخ کا آغاز آرین کی آمد سے کرتے تھے اور ہزاروں سالوں کے بعد انہیں ایک روحانی طرز کی تہذیب کی تخلیق کا موجود قرار دیتے ہیں لیکن ان کے نزدیک مسلمانوں اور

انگریزوں نے اس میں خلل ڈالا اور اثرات مرتب کیے۔ اس سب کے باوجود مہاتما گاندھی کی شخصیت قدر آور تھی۔ ان کا خیر جس مذہب سے اٹھا تھا وہ اسی کی اصلاح کو مقصد حیات بناسکتے تھے اور بنایا۔ مہاتما گاندھی نے ہندو مذہب کو مذہبی لحاظ سے اور ہندو قوم کو سیاسی لحاظ سے وقت جدید کے تقاضوں اور انسان کے شعور ذات کے قریب لانے کی بھروسہ کو شک کی اور اسی مزاحمت میں انہیں قتل بھی کیا گیا اور ان کا بینا مسلمان بھی ہوا۔

ان سطور میں آج کے نتائج اور مہاتما گاندھی کی فکر کا موازنہ کیا جائے تو بقول اکبر ایس احمد مہاتما گاندھی کا موقف یہ تھا کہ مسلمان ہندو سے مسلمان ہوئے اس لیے یہ ہندو ہی ہیں۔ مہاتما گاندھی نے یہ بات سادہ طریقے سے سمجھائی مگر باقی لوگوں نے جیسے ذکر ہوا ہے اور BJP نے بذریعہ طاقت یہ کام کرنے کا اعلان کیا ہے۔ اس لحاظ سے دو باتیں سامنے آتی ہیں کہ گاندھی کا عدم تشدد اور مسلمانوں سے قدرے زمی حکمت عملی تھی جیسے کانگریس، RSS اور BJP نے مسلسل اپنائے رکھا اور اب آزاد ریاست حاصل ہونے اور ایک طاقت بن جانے کے بعد اس نرم حکمت عملی کو طاقت کی حکمت عملی میں تبدیل کر دیا ہے۔

اگر ایسا نہ سمجھا جائے تو پھر یہ ماننا پڑے گا کہ مہاتما گاندھی نے ایک خاص موڑ پر ہندو مذہب میں اصلاح اور سیاسی لاچے عمل دیا تھا جیسے ایک مضمون میں انہیں ہندو ازم کا ایک بڑا پیغمبر قرار دیا گیا لیکن ناکام ہو گیا ہے۔ ۳۰ ہندو قوم عدم تشدد کے بجائے تشدد پر اتر آئی ہے۔ ۱۹۲۰ء کے بعد فسادات کی طویل فہرست ہے جس کا ذکر پچھلی سطور میں ہو چکا ہے جبکہ تازہ صورت زیادہ خطرناک ہو چکی ہے۔

مہاتما گاندھی کی ”تلاش حق“، ان کی آپ بیتی ہے جس میں وہ مذاہب اور سیاسی کشمکش کی باتیں نظر انداز کر گئے ہیں۔ ۳۱ الجبکہ اکبر ایس احمد نے پروفیسر پارکیہ اور Young India کے حوالے سے بیان کیا ہے کہ گاندھی مسلمانوں کے ماضی سے سازگاری پر وہنی طور پر بھی تیار نہیں تھے۔ وہ مسلمانوں کو حملہ آور ہی سمجھتے تھے۔ ۳۲

پنڈت جواہر لعل نہرو کا نقطہ نظر

پنڈت جواہر لعل نہرو بھارت کے معماروں میں سے بہت نمایاں شخصیت ہیں۔ ان کی کتاب ”تلاش ہند“ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ مسلمانوں کے علیحدہ شخص یا ریاست

کے قیام کے نظریے کو کسی طرح ہضم کرنے کے لیے تیار نہ تھے۔ (میرے سامنے تخلیقات لاہور ۲۰۰۳ء کا ترجمہ سامنے ہے۔ پہلے ایڈیشنوں کا ترجمہ بھی نظر سے گزرتا رہا ہے)۔ پنڈت نہرو چونکہ ایک بھارت پر زور دیتے تھے اس لیے مسلمانوں کا مطالبہ پاکستان انہیں حقیقت پسندانہ نظر نہیں آتا تھا۔ وہ بار بار اس طرح کے الفاظ اور تاثرات بیان کرتے ہیں کہ ”سمجھ میں نہیں آتا کہ کسی جمہوری نظام میں مذہبی اقلیتوں کو بھلا اس سے زیادہ اور کون سا تحفظ دیا جاسکتا ہے۔“^{۱۷}

علامہ اقبال کے حوالے سے انہوں نے ایک ایسی بات تحریر کی جو کسی صورت نہرو جیسے تعلیم یافہ اور لکھنے والے کو تحقیقی و مشاہداتی اصولوں کے برعکس نہیں لکھنی چاہئے تھی۔ انہوں نے اقبال کو پاکستان کے اولیں حامیوں میں شمار کیا اور کہا کہ انہوں نے اس تجویز کے مضمرات کو بہت جلد محسوس کر لیا تھا۔ بقول نہرو

شاید انہوں نے اپنا خیال بدل دیا تھا یا پہلے اس پر زیادہ غور نہیں کیا تھا، اور یہ بات انہوں نے ایڈورڈ نامس کے حوالے سے لکھی جب کہ ساتھ ہی علامہ اقبال سے ان کی علالت کے دوران آخری ملاقات کا تذکرہ کرتے ہیں لیکن یہاں وہ اس بات کی تائید اپنی طرف سے کرتے نظر نہیں آتے۔ علامہ اقبال ”خیال کرتے تھے اور ”غور“ بھی کرتے تھے لیکن آخری عمر تک وہ ”پاکستان“ کے لیے لکھتے رہے۔ یہ لکھا ہوا چھپتا رہا۔ نہرو کی نظر سے گزرتا رہا لیکن اسے نظر انداز کر کے ایڈورڈ نامس کے کندھے پر ایک پوری تحریک اور تاریخ کی کہانی ڈال دی۔ اس ساری کہانی سے غیر محسوس طور پر جو بات سامنے آتی ہے وہ یہی تھی کہ انہیں مسلمانوں کا علیحدہ ہو جانا کسی صورت گوارانہ تھا۔ سو وہ خیالی قسم کے دلائل بھی بیان کرنے سے نہیں رکنے اور پنڈت نہرو اس طرح کا تاثرا پنی تحریروں میں جا بجا دیتے رہے ہیں۔ لکھتے ہیں۔

پاکستان یعنی ہندوستان کو تقسیم کرنے کی تجویز خواہ وہ جذباتی حیثیت سے کتنی ہی کشش کیوں نہ رکھتی ہو، اس پسمندگی کا علاج نہیں ہے بلکہ اندیشہ ہے کہ اس سے جا گیردار طبقے کو اور تقویت پہنچے گی اور مسلمانوں کی معاشی ترقی میں تاخیر ہوگی۔^{۱۸}

قائدِ اعظم محمد علی جناح کو مسلمانوں میں ترقی پسند قرار دینے کے باوجود منفی تاثردیتے ہیں کہ سمجھ ہی نہیں آتی قائدِ اعظم کیا چاہتے تھے؟ اور یہ کہ انہیں اپنی صلاحیتوں پر بھروسہ نہیں تھا۔ آگے چل کر لکھتے ہیں کہ

ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ مسٹر جناح اس بات (پاکستان) پر اتنا زور کیوں دیتے ہیں اور باقی ہر مسئلہ پر گفتگو کرنے سے کیوں انکار کرتے ہیں۔^{۱۹} سُمْزِید لکھتے ہیں۔

مسٹر جناح کے مطالب کی بنیاد ایک نئے نظریے پر تھی اور وہ یہ کہ ہندوستان میں دو قومیں ہیں، ہندو اور مسلمان، مجھے نہیں معلوم کہ آخر یہ دو قومیں کیسے ہو گئیں؟ اس لیے کہ اگر قومیت کی بنیاد مذہب پر ہے تو ہندوستان میں صرف دونہیں بہت سی قومیں ہیں۔ دونہائیوں میں سے ایک ہندو ہو سکتا ہے اور دوسرا مسلمان۔ اور اس طرح یہ دونوں گویا دو قوموں کے رکن بن جاتے ہیں۔ یہ چیز میرے فہم و اور اک سے بالاتر ہے۔^{۲۰}

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایک بھائی ہندو رہتا ہے تو دوسرا مسلمان کیوں بن جاتا ہے؟ اسے ہندو رہنے میں کس نے روکا ہے؟ اسے ہندو مت چھوڑ کر مسلمان بننے پر کس نے اکسایا ہے؟ یقیناً پنڈت نہرو کے فہم و اور اک نے اس پر توجہ نہیں کی۔ ورنہ بات آسان ہو جاتی۔

لیکن مسئلہ سمجھ کا نہیں تھا۔ مسئلہ "پاکستان" کی قبولیت کا تھا وہ کسی صورت قبول نہ تھا اس لیے اس کے خلاف دلائل لانے کی کوشش کرنا ہندو رہنماء کا حق بتاتا تھا۔ قائد اعظم کا حق میں دلائل دینا روکا تھا۔ قائد اعظم کے دلائل قوی تھے، کامیاب قرار پائے۔ نہرو کے خیالات نہیں، عزم تھے، کامیاب نہ ہوئے۔ یہی عزم اب زیادہ ترقی پا کر "ہندو اتا" بن گئے ہیں۔

امینی پاکستان ڈے پر منظور کی جانے والی قرارداد

۱۔ ۱۹۴۷ء کو ہم ہندو اس عزم کا بر ملا اظہار کرتے ہیں کہ ہم اپنی آزادی کی جدوجہد جاری رکھیں گے۔ ۱۸۵۷ء ہماری قومی عظمت کا یادگار دن ہے جب آباؤ اجداد کا یہ ورثہ ہمیں واپس ملا۔ حکمت عملی سے ہمارے ذرائع اور طریقہ کار و قیاقہ تبدیل ہو سکتے ہیں جیسے اس وقت ہماری جدوجہد آئینی اور پرامن طور پر جاری ہے لیکن ہمارا نصب العین تبدیل نہیں ہو گا اور وہ سووارجیہ Swarajya کا حصول اور ہندوستان کی مکمل آزادی ہے اور ہم اس مقصد کے حاصل ہونے تک اپنی جدوجہد جاری رکھیں گے۔

۲۔ لیکن ہندوستان کی آزادی کا قطعی مطلب اس کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے کہ اس کی بھیت اور سالمیت برقرار ہے۔ یہ بھیت ہماری مادر وطن اور مقدس سر زمین ہندوستان کے ایک

کنارے سے دوسرے کنارے تک ہے جو ہماری ہزاروں نسلوں پر محیط ہے۔ ہمارے مفکرین کی فکر، ہمارے شاعروں کا موضوع، ہمارے رہنماؤں کا فرمان اور ہمارے سپاہیوں کی ہمتوں کا نشان، ہمارے قومی شخص اور قومیت کا ایک ہونا ہے، ہمارے یعنی ہندوؤں کے لیے ہماری مادر وطن کی تجھیتی اور قومی سلامتی ہمارے ایمان کا ایک لازمی حصہ بن چکا ہے۔ لہذا ہم ہندو آج حلفاً اس عزم کا بھرپور اظہار کرتے ہیں کہ ہم مسلمانوں کی طرف سے ہندوستان میں آزاد پاکستان فیڈریشن بنانے کی کوششوں کی بھرپور مزاحمت کریں گے بلکہ مخالفت کریں گے اور شکست دیں گے۔

تاہم ہم ہندو ایک دفعہ پھر یہ بات واضح کر دینا چاہتے ہیں کہ غیر ہندو اقلیتوں مثاً پارسیوں، یہیساًیوں، یہودیوں اور دوسرے جو جذبے حب الوطنی سے سرشار ہیں اور ہمارے ملک سے اس کی متحده قومی وحدت اور ایک مرکزی ریاست کے لیے ایک ناقابل تغیر و فاداری رکھتے ہیں۔ ہم ان کے ساتھ شہریت کے اشتراک کے لیے راضی ہیں۔ آئینی تحفظات تمام شہریوں کو یکساں طور پر عبادت، زبان، اور رسم الخاط کی آزادی فراہم کریں گے اور اگر کوئی ثقافتی گروہ آبادی کے تناسب سے نمائندگی پر اصرار کریں تو اسے اس بات کی پوری آزادی ہوگی۔ ہم امید رکھتے ہیں کہ جلدی ہمارے تمام ہم وطن بغیر تخصیص ذات، عقیدہ اور مذہب کے یہ احساس کر لیں گے کہ ہمارے مشترکہ مفادات اس بات کے مقاصی ہیں کہ ہم انتہائی یکسوئی اور دیانت داری سے جمہوری خطوط اور شہری مساوات کے حقوق و فرائض کی بنیاد پر ایک متحده اور آزاد ہندوستان میں اد نام کر لیں۔ ہماری اس مخلصانہ خواہش کے باوجود بھی قومیت کے لیے مطلوب تمام شرائط کی تکمیل کے باوجود مسلمان باقی ہندوستانوں سے آگے بڑھ کر ہندوؤں کو نچا دکھانے کی کوشش کرتے ہیں اور بے شک برطانوی حکومت بھی اس معاملے میں مسلمانوں کا ساتھ دے۔ ہم ہندو سجنی خصوصی طور پر اور ہندو سنگھائرن عموی طور پر مزاحمت کریں گے۔ ہندو مہا سجنی قومی بنیادوں اور آبادی کے تناسب سے اپنے حق کے سوا، ایک انجی زائد زمین کے طب گھانیں ہیں۔ مگر ہم اس پر کمر بستہ ہیں اور اعلان کرتے ہیں کہ ہندوؤں کو ان کی سر زمین کے ایک انجی آبادی کی طاقت اور سوئی شہری حقوق سے محروم یا گیا تو ہم ہر ایک کوشش کے خلاف آخوندی و مجبور تریں گے۔

پاکستان سے اقبالستان تک

۱۱ اکتوبر ۱۹۹۸ء کو بالٹھا کرے اندرین ایکسپریس میں اعلان کرتا ہے
ایک ہندوستانی ہونے کے ناطے یہی کافی نہیں کہ ہمارے قوانین کو تسلیم کیا جائے بلکہ لازم یہ ہے
کہ ہم جس طرح رہتے ہیں اس طرح رہا جائے۔ ہماری تہذیب کو قبول کیا جائے اور ہماری
سچائیوں کا احترام کیا جائے اور صرف یہ ہی نہیں بلکہ یہ کہ ہندوواز姆 اس ملک کا سب سے بڑا ماں
جانے والا ہے جو ہندووازム کو ماننے سے انکار کرتا ہے اس ملک میں رہنے کا اسے حق حاصل نہیں
ہے۔ وہ تمام لوگ جو ”ہندوادتا“ کے خلاف زبان کھولتے ہیں معاف نہیں کیے جائیں گے۔ اس
ملک کو ہندووازム کے ساتھ قبول کرو یا اسے چھوڑو۔^{۲۲}

(I.N.Talbot- India and Pakistan P223)

بابری مسجد کی شہادت کے بعد

بھرنگ دل با قاعدہ نوجوانوں کو ہتھیاروں کی تربیت دے رہی ہے۔ ارشاد احمد حقانی کالم
نگار روزنامہ جنگ نے اپنے ایک کالم میں اس تربیتی کمپ کی نشاندہی کی جس کی بھارتی حکومت
نے تصدیق کی اور نوجوان جو تربیت حاصل کر رہے ہیں ان کے عزائم کی وضاحت کی جس
میں ہندو نوجوان کہتے ہیں کہ ہم تمام ہندو مخالف عناصر کو ملیا میث کر کے رکھ دیں گے۔ ہم
ہندوستان میں تمام مزارات اور مساجد تباہ کر دیں گے۔ کشمیر چھوڑنے کا سوال تو ایک طرف ہم
لا ہو اور کراچی پر قبضہ کریں گے اور وشاہندو پریشد نے بھی بھرنگ دل کو ہندوؤں کی سلامتی اور
غیر ہندوؤں کے لیے دہشت کی علامت قرار دیا۔^{۲۳}

ان سیکھو پیدا یا برٹین کا کے کالم نگار نے بھارت کی موجودہ صورتحال کا ایک عالمانہ عکس پیش کیا
ہے۔ حقائق کی تصویر کشی ایک مستند انداز میں سامنے لا آئی ہے۔ اس کا بغور مطالعہ کریں تو وہ سارے
نکات جو اس تحریر کی وجہ بنے وہ عیاں ہو جاتے ہیں۔

Domestically the growing tide of Hindu nationalism was one the major developments in India in the last decade of the 20th century, reflected the remaining of several major cities-Mumbai (Bombay), Kolkata (Calcutta), and Chennai (Madras)-and the rise of parties such as the BJP. The rising nationalist-sectarian rhetoric and political action was the source of intense and often violent conflict between Hindus and Muslims. Hindu nationalists sought to diminish minority rights and promote India as a Hindu state.

Generally, the country continued to face increasing violence and disorder on the local level, as well as demands for regional autonomy or independence in various areas including Punjab, Assam and Jammu Kashmir. Three new states Chhattisgarh, Jharkhand and Uttearamachal, were formed following persistent campaigns by native groups.²⁴

گویا:-

- ہندو قومیت کو بھارت کی اساس قرار دینا بیسویں صدی کے اس آخری عشرے میں سب سے نمایاں عمل ہے۔
- پرانے شہروں کو نئے نام دینے کے عمل کا ذکر جبکہ مساجد کی جگہ مندوں کی تعمیر کا اس پیرے میں ذکر موجود نہیں ہے جو کہ واضح طور پر سب کے سامنے ہے۔
- BJP کا اجھرنا بھارتی قومیتی سیاست کا بہت بڑا واقعہ ہے۔
- ہندو قومیت بنیاد پر سیاسی حرکت و عمل ہندوؤں اور مسلمانوں میں فرقہ واریت کا اہم ترین سبب ہے۔
- ہندو قومیت کے علمبردار اقلیتوں کو ان کے اقلیتی حقوق دینے کے حق میں نہیں ہیں۔
- ہندو بھارت کو اب صرف ایک ہندو ریاست کے طور پر شخص بحال کرنا چاہتے ہیں۔
- اس کا رد عمل بھارت کا آزاد ریاستوں میں اضافے کی تحریک کا سامنا ہے (جس میں ہندو مسلم اکثریت و اقلیت کے عوامل کا فرمائیں ہیں)۔
- پنجاب (خالصتان)، آسام اور جموں و کشمیر مکمل خود مختاری کے لیے جدوجہد کر رہے ہیں۔
- جبکہ اندر ورنی خود مختاری کی تحریکیں بھی نمایاں ہیں جس کے نتیجہ کے طور پر حال ہی میں تینی ریاستوں کا قیام لا یا گیا جن میں Jharkhand، Chhattisgarh، اور Uttarnchall شامل ہیں۔

حوالہ

- ۱۔ اقبال کے خطوط جناح کے نام۔ ترتیب: محمد جہانگیر عالم، اقبال اکیڈمی لاہور ۲۰۰۲ ص ۷۳
- ۲۔ محمد اقبال صدیقی (ترجمہ) قائد اعظم۔ تقاریر و بیانات۔ جلد دوم، بزم اقبال، لاہور ۱۹۹۷ء، ص ۸۷-۱۸۶
- ۳۔ " " " بحوالہ دی استار آف انڈی، جنوری ۱۹۳۸ء، ص ۲۰۰
- ۴۔ " " " رججنوری ۱۹۳۵ء، ص ۲۰۳-۲۰۱
- ۵۔ ۲۹-۵۱، I.N. Talbot, *India and Pakistan*
- ۶۔ ۸۰، The Saffron Wave
- ۷۔ ۵۱، I.N. Talbot
- ۸۔ ۱۸۰، I.N. Talbot اور Hensen ۱۹۹۹
- ۹۔ ۲۲۳، I.N. Talbot
- ۱۰۔ ۲۲۱، I.N. Talbot، اکبر ایس احمد، *Jinna, Pakistan & Islamic Identity*
- ۱۱۔ ایضاً " " " ۲۲۷-۲۳۱، ص ۱۰۳
- ۱۲۔ ایضاً " " " ۱۰۳
- ۱۳۔ ڈی ایس شرما (ضمون نگار) مہاتما گاندھی ۲۰۰۲، ص ۲۶۸
- ۱۴۔ مہاتما گاندھی، تلاش حق، فلشن ہاؤس لاہور ۲۰۰۳
- ۱۵۔ اکبر ایس احمد، ص ۱۰۳
- ۱۶۔ پنڈت جواہر لعل نہرو، تلاش ہند (ترجمہ) تخلیقات، لاہور، ۲۰۰۳ء، ص ۳۹۳
- ۱۷۔ ایضاً، ص ۳۵۱
- ۱۸۔ ایضاً، ص ۵۰۲
- ۱۹۔ ایضاً، ص ۵۰۳
- ۲۰۔ ایضاً، ص ۵۰۵
- ۲۱۔ ٹرانسفر آف پاور (برٹش لائبریری لندن)، ص ۲۲۳
- ۲۲۔ I.N. Talbot, *India and Pakistan*
- ۲۳۔ ارشاد احمد حقانی روزنامہ جنگ، لندن، ۱۸، ارجولائی ۲۰۰۰ء
- ۲۴۔ انسائیکلو پیڈیا برٹین کا جلد ۲۱، ص ۱۱۶

اقبالستان.....ارض اقبالستان

یہ ان کا پختہ عقیدہ ہے کہ وہ جس بات کی وکالت کر رہے ہیں وہ نہ صرف مسلمانوں کے مفاد میں ہے بلکہ دیگر فرقوں کے مفاد میں بھی ہے۔ انہوں نے خیال ظاہر کیا کہ ہند بھی بھی ایک قوم نہیں رہا اور یہاں بھی بھی ایک قومی حکومت نہیں رہی۔ نمائندہ پارلیمانی طرز کی حکومت کی تو بات ہی الگ ہے۔ یہاں ہمیشہ مطلق الغان حکومت رہی۔ وہ ہندو کی ہو یا مسلمان فرمانروائی۔ انہوں نے کہا اس وقت برطانوی ٹکنیک نے اسے یکجا رکھا ہوا ہے۔ جو نبی یہ ہٹی تو ہند ایک جغرافیائی وحدت کے طور پر بھی بزرگ نہیں رہے گا۔

پاکستان پر اپنے یقین کا اعادہ کرتے ہوئے مسٹر جناح نے کہا، ایک فرد کی حیثیت سے میرا یہ یقین ہے اور یقیناً مسلمانوں کی عظیم اکثریت بھی ایسا ہی سمجھتی ہے کہ اپنی آزادی کے حصول کے سلسلہ میں پاکستان واحد حل ہے۔ جب میں اپنی آزادی کی بات کرتا ہوں تو میری مراد ہوتی ہے ہندوؤں اور مسلمانوں کی آزادی جو فی الحقیقت اس ملک کی دو بڑی قومیں ہیں۔^۱

”اقبالستان“ فکر مستقبل ہے۔ برعظیم پاک و ہند کے مسلمانوں، عیسائیوں اور دوسری مذہبی اقلیتوں بشمل پچلی ذات کے ہندوؤں کے لیے خوف و غم سے پاک زندگی کی ضمانت ہے۔ ”اقبالستان“ ہندوستان سے باہر کوئی چیز نہیں ہوگی۔ ہندوستان کے رقبے پر ہی مشتمل ہوگی۔ ہندوستان تقسیم نہیں ہوگا۔ یہ تقسیم کی اصطلاح بھی محض قیام پاکستان کو روکنے اور آئندہ کے ”ہندو اتا“ کو سند جواز بخشنے کا بہانہ اور حکمت عملی تھی۔ مسلم دانشور بھی ”تقسیم“ کی اصطلاح کو اختیار کیے ہوئے ہیں۔ تقسیم کا تصور یہ پیدا کیا گیا کہ مسلمان باہر سے آئے تھے اور ہندوستان کو تقسیم کر کے اس کا کچھ حصہ ”پاکستان“ بنایا کر ہندوستان سے الگ ہو گئے ہیں۔ ہندوستان کی نئی انتظامی تقسیم کو ہندستان کی تقسیم کے مترادف لے لیا گیا۔ علاقوں کی انتظامی دلکھ بھال کے لیے مختلف

علاقوائی یونٹ بنانا، پرانا انتظامی فارمولہ ہے جو ہندوستان میں ہمیشہ راجح رہا۔ مسلمانوں کے پورے دور میں بھی ایسا کبھی نہیں ہوا کہ ہندوستان انتظامی لحاظ سے ایک یونٹ رہا ہو اور جب انگریز نے قبضہ کیا تو تب بھی صورتحال کئی یونٹوں میں تقسیم تھی۔ صوبوں کے علاوہ ۵۳۶ ریاستیں ہندوستان کے مختلف حصوں میں ایک خاص معاهدے کے مطابق ایک آزاد یونٹ کی حیثیت سے قائم تھیں جن میں حیدرآباد، جموں کشمیر اور جونا گڑھ اس دور کے مطابق قریب قریب آزاد و خود مختار مملکتوں کے درجے پر تھیں۔ اور اس وقت بھی بھارت ۲۰ ریاستوں اور پاکستان ۲۳ صوبوں میں تقسیم ہے۔ اس لیے ذہن کو بد لئے کی ضرورت ہے اور برعظیم پاک و ہند کے تمام انسانوں میں ہندو مسلم کو کسی ایک طاقت کے نیچے دبا کر رکھنے کے بجائے مناسب حد تک آزاد یونٹ تشکیل پانے کی ہمت افزائی کی جانی چاہیے۔

”اقبالستان“ آزاد یونٹ کے قیام اور ان میں رہنے والے تمام انسانوں کو ان کے بنیادی حقوق کے حاصل کرنے کا نام ہے۔ ”اقبالستان“ کا مطلب یہ ہے کہ وہ اکثریت کے جارحانہ عزائم کو رو کے جو اس نے ”ہندو اتا“ کے فلفے کے تحت مسلمانوں اور دوسری تمام اقلیتوں کے لیے زندگی خوف و غم میں بتلا کر دی ہے۔ ”ہندو اتا“ کو ایک تصور قومیت کے روپ و رنگ میں پیش کیا جا رہا ہے۔ یہ تصور قومیت یورپ کے افکار قومیت اور کچھ کچھ جرمی کے نازی نیشنل ازم کی منطق استعمال کر رہا ہے۔

دو قسم کے تصور قومیت انسانی تاریخ سے ثابت چلے آ رہے ہیں۔ ایک تصور قومیت میں دوسرے مذاہب یا علاقوے یا تہذیب یا رنگ یا زبان کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی سوائے اس کے کہ وہ بھگادیے جائیں یا مٹادیے جائیں۔ یورپ کا تصور قومیت بھی مذکورہ آلاتشوں میں سے کسی ایک یادو کو حریز جان بنائے ہوئے ہے چہ جائیکہ وہ دستوری لحاظ سے ”انسانی نعرے“ کو والا پتے ہوں جبکہ ”ہندو اتا“ کا واضح اعلان ہے کہ ہندو بنو یا بھارت چھوڑو۔

دوسرा تصور قومیت وہ ہے جو سب انسانوں میں اپنے مذہبی اور انسانی حقوق کی بنیاد پر امتیاز نہیں کرتا۔ اس کے احترام پر ایک نظم حکومت تشکیل دیتا ہے۔ کئی ایک پہلوؤں سے اسلامی عمل میں کمزوری کے باوجود مسلمانوں کا نظم حکمرانی دوسرے مذہبی، انسانی، تہذیبی یا زبان کی بنیاد پر مٹانے یا غیر انسانی برداشت کی اجازت نہیں دیتا۔ اس وقت بھی دنیا میں ۷۵ مسلم ممالک میں غیر مسلموں کی تعداد موجود ہے۔ تمام مسلمان ملک سوائے ایک دو کے ایک جابرانہ نظام حکومت کے تحت چل

رہے ہیں۔ فوجی ڈکٹیئٹریا شاہی نظام حکمرانی کے ماتحت ہیں۔ لیکن کسی مذہبی اقلیت کو یہ خوف و غم نہیں کہ انہیں مٹا دیا جائے گا۔ انہیں پورے انسانی حقوق حاصل ہیں۔ گویا موجودہ مسلم حکومتوں کا بدترین نظام بھی کسی امتیاز کی بنابر مٹا دینے کا روادار نہیں ہے کیونکہ اسلامی عقائد و تہذیب اس کی اجازت نہیں دیتے ہیں۔

یہی وہ جو ہری امتیاز اور فرق ہے! پاکستان کا قیام بھی اسی فلکر کا نتیجہ تھا۔ علامہ اقبال نے جس وطنیت کو مسترد کیا تھا وہ یہی تھا۔ سابق ہندوستان یا انڈیا اور موجودہ ہندی نام بھارت ہے۔ انگریزی میں بھارت کو (Bharat) کم اور "India" زیادہ لکھا جاتا ہے اور اس حکومت کے باعث بھارت دنیا کو یہ باور کرانے میں کامیاب رہا ہے کہ تاریخی ہندوستان یا انڈیا صرف وہی ہے جس کی نمائندگی اب بھارت کرتا ہے۔ حالانکہ سابق ہندوستان یا انڈیا کی نمائندگی بھارت کے علاوہ پاکستان، بنگلہ دیش، نیپال اور بھوٹان بھی کرتے ہیں۔

بھارت کا کل رقبہ ۲۲،۲۲۳ میل (۳،۱۶۵،۵۹۶) مربع کلومیٹر ہے۔ اس کی سرحدیں سمندر کے علاوہ چھ آزاد ممالک سے ملتی ہیں۔ کل سرحد ۹۳۵ میل (۱۵۱۸ کلومیٹر) ہے جس میں سے ۳۵۳ میل (۵۶۸۶) کلومیٹر کو سٹ لائن ہے۔ چین، پاکستان، بنگلہ دیش، نیپال، بھوٹان اور برمادری ممالک ہیں۔ بحیرہ عرب اور بنگال بے ہے۔ Lakshad (بحیرہ عرب) اور انڈیمان Andaman اور نکوبار Nicobar مکمل جزائر کے طور پر بھارت کے پاس ہیں۔

ہندوستان کئی مذاہب، قبائل اور ذاتوں کا گڑھ رہا ہے جس میں درجن سے زائد بڑی زبانیں اور سینکڑوں مقامی زبانیں رائج چلی آ رہی ہیں۔ اکثریت اور اقلیت کے رنگ اور معیار بدلتے رہے ہیں۔ اس وقت ہندو مذہب کے لوگ اکثریت میں ہیں مگر وہ پانچ بڑے سماجی طبقات میں تقسیم ہونے کے ناطے پانچ بڑے مذہب بن جاتے ہیں۔ لوگوں کے ساتھ درجہ بندی یا سماجی اونچ تج کا سلوک تب تک قابل برداشت رہتا ہے جب تک لوگوں کو یہ معلوم نہ ہو جائے کہ ان کے ساتھ نا انصافی مذہبی عقیدے یا سماجی درجے کی بنیاد پر ہو رہی ہے۔

ہندو اکثریت میں پہلا بڑا اور تاریخی سماجی طبقہ برصغیر کا ہے اور آج بھی سماج پر وہی حاوی ہے۔ چاہے وہ سماجی رتبہ ہو یا معاشرتی اثر و رسوخ، مذہبی سیادت برصغیر کے ہاتھ میں ہے۔

دوسری طبقہ کھشتیری ہے جو جنگویانہ اور دفاعی امور کے لیے موزوں سمجھا جاتا ہے۔ سماجی لحاظ سے یہ طبقہ بھی طاقتور اور بڑے رتبے والا ہے۔ برصغیر اور کھشتیری مل کر باقی طبقات پر حکمرانی

کرتے ہیں۔ تیسرا طبقہ و شنو جو کسان پیشہ میں شامل ہیں۔ تجارت پیشہ طبقہ بھی اب اس میں شامل ہے۔ مال دار طبقہ ہے اور سیاسی اثر و رسوخ میں اب بہتر ہے جبکہ شودر مذہبی اور آئینی لحاظ سے خستہ حال طبقہ ہے جس کا کام صرف ان تین بڑے سماجی طبقات کی خدمت کرنا ہے۔ اس کے علاوہ ان کے اور کوئی مذہبی یا سیاسی حقوق نہیں ہیں۔ ووٹ ابھی تک دوسروں کے لیے ہے۔ ممکن ہے مستقبل میں ووٹ ان کا سماجی رتبہ بدل دے۔ شیڈ ولڈ ذات یا جن کو چھوٹا ناپاک کر دیتا ہے سماجی لحاظ سے سب سے کم تر طبقہ ہے۔ جبکہ اس وقت بھی ۶۔ اتناسب سے دوسری اقلیتیں بھارت میں رہتی ہیں اور مسلمانوں کا اکیلے تناسب ۹۔ ۱ کا ہے۔ یہ تسلیم شدہ بات ہے کہ ۲۰۰۰-۲۶۰۰ قبل مسح سے ایران و یورپ سے آرین آئے جس کی تفصیل ابتدائی صفحات میں بیان کی گئی ہے اور یہ مختلف اطراف سے ہجرت کر کے آئے اور پھر مقامی اثرات و ماحول کا نتیجہ ہے کہ ہندوستان میں کئی ذاتیں، قبائل، رنگ اور نقوش پائے جاتے ہیں۔ ہندوستان کے شمالی مرکز اور شمال مغربی حصے تہذیب اور زبان کے حوالے سے یورپ اور انڈو یورپ سے ممائش رکھتے ہیں۔ یہ کاکیز (Caucases) جنوب مغربی یورپ اور وسط ایشیاء کے علاقے ہیں جبکہ شمال مشرقی ہندوستان، مغربی بنگال کا علاقہ ہمالیہ کے مغرب تک اور لداخ کے لوگ ایشیائی نسل سے قریب لگتے ہیں جیسے تبتی اور برمی لوگ ہیں۔

جہاں تک زبانوں کا تعلق ہے۔ زبانوں کے دو بڑے خاندان ہندوستان میں راجح چلے آ رہے ہیں۔ ایک انڈو یورپین بیرونی زبانیں اور دوسری مقامی جسے ڈراوڑی کہتے ہیں۔ یاد رہے ہندی بھی بیرونی زبان ہے مقامی نہیں۔ بھارتی آئین میں ۱۸ ازبانوں کو آئینی تحفظ دیا گیا ہے جن میں ۳۲ اراغنڈو یورپین شاخیں ہیں۔ ان میں ہندی، اردو، سندھی، کشمیری، آسامی، بنگالی، گجراتی، کنکانی، مراٹھی، نیپالی، اوریہ، پنجابی، سنکریت شامل ہیں جبکہ کانادا (Cannada) میلے یہ malayalam (malayalam) تامل اور تملکو مقامی یعنی ڈراویڈین شاخیں ہیں جبکہ زبان منی پوری Sini-Tibetin مسلم اور دوسری اقلیتیں ۲۲ میں سے ۳ حصوں پر مشتمل ہے۔ ہندی اس وقت سب سے بڑی بیرونی زبان ہے ۳۰ کروڑ کے لگ بھگ یہ زبان لوگ بولتے ہیں۔ البتہ اس کے آگے کئی لمحے ہیں جو علاقائی طور پر تقسیم ہیں۔ یعنی مشرقی اور مغربی حصوں میں ہندی مختلف انداز سے بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ دوسری زبانیں مختلف ریاستوں میں سرکاری طور پر راجح ہیں۔ البتہ اردو بھارت کی کسی

ریاست میں اب سرکاری زبان نہیں ہے یہ بات نوٹ کرنے کے قابل ہے۔ مذاہب میں ہندومت اکثریت والا مذہب ہے۔ تقریباً ۸۰ فیصد آبادی کا مذہب ہندو ہے جس میں آگے کئی تقسیمیں موجود ہیں۔ مسلمان دوسری بڑی مذہبی قوت ہے جو بات اہم ہے وہ یہ ہے کہ بہت سے مسلمانوں کا بھارت سے ۱۹۳۷ء میں ہجرت کر کے آنے کے باوجود مسلمان بھارت کے ہر شہر اور قصبے اور گاؤں میں تھوڑی بہت تعداد میں موجود ہیں۔ اتر پردیش، مغربی بنگال اور کیرالہ میں زیادہ تعداد میں ہیں جبکہ تیسری اقلیت عیسائی ہیں۔ بہبی اور جنوب کی طرف زیادہ آباد ہیں۔ سکھ پنجاب میں اور بدھ مت کے پیروکار مہاراشٹرا، سکم، اڑونا چل میں آباد ہیں۔ ایک اور مذہب جیسی ملت کی خاصی تعداد بھارت میں پائی جاتی ہے۔ مہاراشٹرا، گجرات اور راجستھان میں یہ لوگ رہتے ہیں۔ پارسی بھی ایک مختصر تعداد میں رہتے ہیں۔ ذات پات کی گہری تقسیم کے ساتھ ہندوؤں میں داخلی طور پر بھی خصوصاً خداوں پر مختلف آراء اور پھر اس کی بنیاد پر عبادت کی جاتی ہے۔

شمالی اور وسطیٰ بھارت میں زیادہ تر ہندو وشنو (Vishnu) کو مانتے ہیں اور مندروں میں عبادت کرتے ہیں۔ راما اور کرشا وشنو، ہی کے کردار ہیں جبکہ سیوا (Saiva) کو ماننے والے ہندو تامل نادو، کرناٹک، مغربی مہاراشٹرا اور ہماں یہ کے بعض علاقائی حصوں میں رہتے ہیں۔ عبادات کا تعلق یہاں شک्तی (Shakti) خدا سے ہے جو خداوں کا سب سے بڑا خدا ہے۔

شک्तی (Shakti) جو Mother Goodness کا رتبہ رکھتا ہے اس کی عبادت کرنے والے مغربی بنگال، آسام اور اتر پردیش خصوصاً ہماں یہ کے اطراف اور ہما چل پردیش کے علاقوں میں پائے جاتے ہیں۔

مسلمان بھارت میں ہر جگہ پائے جاتے ہیں۔

عیسائیوں کا زیادہ ٹھکانہ مغربی کنارہ وار جنوبی ہند ہے۔

بدھ تبت سرحد کے ساتھ زیادہ تر رہتے ہیں۔

- ۱ -

North West India

چندی گڑھ، ہریانہ، ہما چل پردیش، پنجاب، راجستھان کے علاقے شمال مغربی بھارت کا

پاکستان سے اقبالستان تک

حصہ ہیں۔ چندی گڑھ پنجاب کے دارالحکومت کے طور پر ۱۹۵۰ء میں تعمیر ہونا شروع ہوا مگر ۱۹۶۶ء میں بھارتی پنجاب پنجابی سکھ اور ہندی زبان بولنے والوں کے درمیان تقسیم ہوا۔ چندی گڑھ کو بھارتی یونین میں شامل کر کے اسے دونوں کا دارالحکومت قرار دیا گیا۔ اس کے نتیجے میں ہریانہ کی ریاست بھی ۱۹۶۶ء میں بنی۔ چندی گڑھ کا رقبہ ۳۲۳ ہزار مرلے میل ہے جبکہ ہریانہ کا رقبہ ۷۰۔۷۰ امرلے میل ہے۔ ۹۰ فیصد ہندو آبادی اور باقی سکھ ہیں۔ زرعی صنعت میں نمایاں ہے۔

ہما چل پر ولیش:

بھارتی یونین کی اس ریاست کا رقبہ ۲۱،۳۹۵ امرلے میل ہے۔ یہ پہاڑی علاقہ شمار ہوتا ہے۔ ۹۵ فیصد ہندو آبادی ہے جبکہ باقی مسلمان اور عیسائی ہیں۔ زراعت اور جنگلات ذریعہ روزگار ہے۔ آبادی زیادہ تر دیہاتی ہے۔ شمالہ واحد شہر قرار دیا جاسکتا ہے۔ دوسرے قصبوں میں بیلاسپور، چمیا، دھرم سہالہ، پالم پور اور دوسرے شہر شامل ہیں۔ گورنر مركز کی طرف سے نامزد ہوتا ہے۔ اس کے ۱۱۲ اضلاع ہیں۔ شمالہ اور کلووگullu سیاحتی مرکز ہیں۔ کلوکو خدا کی وادی بھی کہتے ہیں۔

پنجاب:

یہ بھی بھارتی یونین کی ریاست ہے جو ہندی اور پنجابی میں تقسیم ہونے کے بعد ۳۳۵ امرلے میل تک محدود ہے۔ ۶۰% سے زائد سکھ ہیں۔ اس کے معروف شہر امرتسر، لدھیانہ، جالندھر اور پٹیالہ ہیں۔ ۷۰ فیصد زراعت پیشہ ہے۔ گورنر مركز کی طرف سے نامزد ہوتا ہے۔ اس کے ۱۱۲ اضلاع ہیں۔

راجستھان:

یہ بھی مرکز کے تحت ایک ریاست ہے۔ اس کے مغرب اور شمال مغرب میں پاکستان ہے جبکہ دوسری طرف بھارتی پنجاب ہے۔ اس کا رقبہ ۱۳۲۱۳۰ امرلے میل تک پھیلا ہوا ہے۔ جے پور اس کا دارالحکومت ہے۔ یہ ایک بڑی ریاست ہے۔ اسے راجپوتانہ یعنی راجپوت لوگوں کا علاقہ بھی کہا جاتا ہے۔ ۱۹۳۷ء سے پہلے یہاں ۱۸ ریاستیں قائم تھیں۔ ۱۹۳۷ء کے بعد آہستہ آہستہ ان

ریاستوں کے وجود کو بھارتی یونین ایکٹ ۱۹۵۶ء کے تحت ختم کر کے حصہ بنادیا گیا اور نام بھی راجستھان رکھ دیا گیا۔ نہیں معلوم کہ بھارتی یونین نے پاکستان یا اقبالستان طرز پر اس کی اجازت کیوں دی؟ یہاں کی زبان راجستھانی ہے۔ ہندو ازם بڑا مذہب ہے۔ برصغیر، شیوا، سکتی، وشنووار دوسرے خداوؤں کو مانا جاتا ہے۔ اسلام یہاں دوسرا بڑا مذہب ہے۔ اجمیر شریف بھی اسی ریاست میں ہے۔

جمول کشمیر:

مقبوضہ جموں کشمیر جو حصہ بھارت کے زیر سلطنت ہے بھی اسی حصہ میں واقع ہے۔ بھارت کے پاس کشمیر کا کل رقبہ ۳۸،۸۳۰ مربع میل پر مشتمل ہے۔ اقبالستان کے نئے تصور کی بنیاد پر یقیناً جموں کشمیر ہو گی۔

North Central India ۲۔

دھلی: بھارت کا دارالحکومت ہے۔

مدھیہ پردیش:

۱۱۹،۰۱۶ مربع میل علاقے پر مشتمل ہے۔ بھارت کے وسط میں واقع ہے۔ بھوپال اس کا دارالحکومت ہے۔

چتھیس گڑھ:

یہاں منی کے ۳۶ قلعے ہیں۔ یہ ریاست ۱۹۹،۵۲ مربع میل پر مشتمل ہے۔ رائے پور دارالحکومت ہے۔ دونوں ریاستوں میں کم ذات کے لوگ یعنی شید و لذ ذات یا دوسرے لفظوں میں اچھوت زیادہ ہیں۔ دونوں ریاستوں میں ہندی زبان بولی جاتی ہے۔ دوسری بڑی زبان میراخی ہے۔ اردو، گجراتی اور پنجابی بھی بولی جاتی ہے۔ آبادی زیادہ تر ہندوؤں پر مشتمل ہے۔ البتہ مسلمان، عیسائی، بدھ، جین اور سکھ بھی رہتے ہیں۔ گورنر کے ماتحت دونوں ریاستیں مرکز کی نمائندہ ہیں۔

اتر پردیش:

گھنی آبادی پر مشتمل اس ریاست کا رقبہ ۹۳۳-۹۳۴ مربع میل ہے۔ اس کی سرحد نیپال سے ملتی ہے۔ اسے یہ نام ۱۹۵۰ء میں دیا گیا اور ۲۰۰۰ نسلیں اس کے پہاری صوبے کوئی ریاست بنادیا گیا جس کا نام اترن چل رکھا گیا جس کا رقبہ ۳۹،۷۳۹ مربع میل ہے اور اس میں اتر پردیش کے مقابلے میں آبادی بہت کم ہے۔ سیاسی نقطہ نظر سے بھارت کی سیاسی و سماجی تشکیل میں یہاں کے لوگوں کا گہرہ اہانتہ ہے۔ نہرو اور واچپانی اسی ریاست سے تعلق رکھتے تھے۔

North East India - ۲

ارونا چل پردیش:

بجوان کے مغرب میں تبت کے شمال اور برما کے جنوب، جنوب مشرق سے گھری ایک سرحدی ریاست کے طور پر ۳۲،۳۳۳ مربع میل علاقے پر مشتمل ہے۔ زیادہ پہاڑی علاقہ ہے۔ لوگوں کی اصل تبتی اور برما ہے۔ خدوخال بھی انہی جیسے ہیں۔ سرحدی علاقے میں لوگ بھی زیادہ تر بدهندہ ہب سے تعلق رکھتے ہیں۔

آسام:

ریاست آسام کا رقبہ ۳۰۲۸۵ مربع میل ہے۔ یہ اب تقسیم شدہ ہے۔ اروننا چل، ناگالینڈ، میزورام اور میگالیہ پہلے آسام کا حصہ تھے۔ آسام کی آبادی کافی بڑی ہے جس میں بنگلادیش سے آنے والے بھی شامل ہیں۔ آسامیوں میں دو تباہی ہندو ہیں جبکہ مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد موجود ہے۔ آسامی بھی ایشائی طرز کی نسل سے ملتے ہیں۔ تبتی، برما زبان ہے جسے آسامی بھی کہا جا سکتا ہے۔ آسامی ۱۹۶۰ء میں آسام کی سرکاری زبان بنی۔ عیسائی مشریعوں نے یہاں اپنے کام میں کامیابی حاصل کی ہے۔

بہار اور جارکند:

بہار کا رقبہ ۳۸۲۰۱ مربع میل ہے جبکہ ۲۸۸۳۳ مربع میل پر مشتمل ریاستیں ہیں۔ بہار کا دارالحکومت پٹنہ اور جارکند کا رانچی ہے۔ بہار کی بھارتی یونین میں ایک خاص اہمیت رہی ہے۔ ہندوؤں کے بعد مسلمانوں کی خاصی آبادی ہے جبکہ جارکند میں عیسائی بھی ہیں۔ ہندوؤں میں بڑی تینوں ذات کے لوگ تعداد میں کافی ہیں جبکہ شودرا اور کم ذات کے لوگ بھی ہیں۔

منی پور:

چھوٹی سی ریاست ۸۶۱ مربع میل رقبے پر مشتمل ہے جو بنگال کے علاقے میں شمار ہوتی ہے۔ دارالحکومت امفال (Imphal) ہے۔ مہتی (Meithi) نسل کے لوگ آباد ہیں۔ زیادہ تر ہندو ہیں۔ زبان تبتی، برما بھی ہے مگر ۶۰ فیصد لوگ منی پوری زبان بولتے ہیں۔

میجالیہ:

۱۹۷۲ء میں ریاست قرار دی گئی۔ ۸۶۰ مربع میل رقبہ ہے اور اس کا دارالحکومت پہاڑی شہر Shillong ہے۔ تبتی، برمنی لوگوں کی اکثریت ہے۔ ان کی جنوب مشرقی ایشیائی زبان ہے۔ عیسائیت اور ہندو ازام اکثریت میں ہے۔ مسلمانوں کی تھوڑی تعداد موجود ہے۔ سکھ اور بدھ معمولی تعداد میں ہیں۔ حکومت کے خلاف خود مختاری کی جو تحریک آسام میں اور اس علاقے میں ۱۹۶۰ء سے چل رہی ہے، اسی بناء پر اس ریاست کا قیام عمل میں آیا۔

میزورام:

۱۹۸۷ء میں ریاست قرار پائی۔ ۸۱۳۰ مربع میل پر مشتمل ہے۔ پہلے یہ آسام کے پہاڑی اضلاع پر مشتمل علاقہ تھا۔ ۱۹۵۳ء میں اس کا نام میزورام رکھا گیا بنگلہ دیش کے ساتھ سرحد لگتی ہے۔ میزورام کا مطلب زیادہ زمین والا ہے۔ میزورام بھی تبتی برما نسل کے لوگ ہیں۔ میزورام کے سرکاری زبان ہے۔ میزورام کا طرز پلکھی جاتی ہے۔

۸۰ فیصد آبادی عیسائی ہے۔ زیادہ تر پوئشٹ ہیں۔ اس کے علاوہ ہندو اور بدھ ہیں۔ مسلمانوں کا واحد اس ریاست میں ذکر نہیں کیا گیا ہے۔ اس ریاست کے ۳ اضلاع ہیں۔

نا گالینڈ (Nagaland):

اس ریاست کا رقبہ ۶۳۰ مربع میل ہے۔ اس کا دارالخلافہ Kohima ہے۔ جغرافیائی مناسبت سے قبائلی علاقہ ہے۔ Sino Tabtin زبان کئی نسلوں سے تعلق رکھنے والی جس کے قریب قریب ۶۰ لمحے ہیں، بولی جاتی ہے۔ یہاں بھی عیسائیت کی اکثریت ہے۔

اوریسیا (Orissa):

کارقبہ ۱۱۹۔ ۶۰ مربع میل ہے۔ یہ بھی زیادہ تر قبائلی اور ہندو مذہب کی طرف رغبت رکھنے والے ہیں۔ ڈراوڈین زبان اور نسل موجود ہے۔ اب ۵۷ فیصد لوگ Oriya زبان بولتے ہیں جو زیادہ تر بولی میں ہی آتی ہے۔ اکثریتی ہندو اور مسلمان اقلیتی صورت میں یہاں آباد ہیں۔ عیسائی بھی پائے جاتے ہیں۔

سکم (Sikkim):

دوسری سب سے چھوٹی ریاست جو صرف ۲۷۳۰ مربع میل علاقے پر مشتمل ہے۔ یہ بھوٹان نیپال اور چین کی سرحدوں سے ملک ہے۔ یہ آزاد ریاست تھی مگر ۱۹۷۵ء میں بھارتی آئین کے تحت ریاست قرار پائی۔ لوگ نیپالی نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔ ہندوؤں کی اب اکثریت ہے۔ بدها زم کے لوگ دوسری اقلیت ہیں۔ مسلمان اور عیسائی بھی موجود ہیں۔ یہ چار اضلاع میں تقسیم ہے۔ تجتی اثرات نمایاں ہیں۔

تری پورہ (Tripura):

۳۰۳۹ مربع میل علاقے پر مشتمل یہ ریاست بھلہ دیش کی سرحد کے ساتھ لگتی ہے۔ گوا اور سکم کے بعد بھارت کی چھوٹی ریاست ہے۔ اگر تھے اس کا دارالحکومت ہے۔ ۳۰ فیصد سے زائد آبادی

شید و لذذات سے تعلق رکھتی ہے۔ بنگالی اور تری پوری دونوں زبانیں بولی جاتی ہیں۔ ہندو مذہب کی اکثریت ہے۔ البتہ مسلمان، عیسائی اور بدھ مذہب کے ماننے والے بھی رہتے ہیں۔

ویسٹ بنگال:

اس ریاست کا رقبہ ۷۴۳۲۶ مربع میل ہے۔ آبادی بہت زیادہ ہے۔ کلکتہ اس کا دار الحکومت ہے۔ ۱۳۵۰ میل بھی سرحد بنگلہ دیش سے ملتی ہے جو ایک متنازع صورت میں آرہی ہے۔ ہندوؤں کی اکثریت ہے مگر قبائلی تنازعات، بہت زیادہ ہیں۔ مسلمانوں کی بڑی تعداد موجود ہے۔ مرشد آباد کا شہر مسلمانوں کی اکثریت کا شہر ہے، بدھ، عیسائی اور سکھ بھی پائے جاتے ہیں۔ انتظامی لحاظ سے ریاست منظم ہے۔ ہائی کورٹ بھی ہے۔ اراضیاع پر مشتمل ہے۔

West And West-Central India

ڈڈرا (Dadra) نگر حویلی:

مہاراشٹر اور گجرات کے درمیان یہ علاقہ ۱۹۰۱ مربع میل جس میں ڈڈرا کے ۳ گاؤں اور نگر حویلی کے ۲۹ گاؤں آتے ہیں۔ گوا (Goa) کے گورنر کے تحت ہے۔ دار الحکومت سلوسا ہے۔ یہ پرتگالی نوا آبادی تھی۔ ۱۹۵۳ء میں بھارتی مدد سے انہوں نے پرتگالیوں سے آزادی حاصل کی اور ۱۹۶۱ء میں ریاست نے بھارت کے ساتھ با قاعدہ الماق کر لیا۔ بھارتی حمایت یافتہ حکومت پہلے سے وہاں قائم تھی۔ قبائلی علاقہ ہے۔ ہندو اکثریت میں ہیں۔ مسلمان اور عیسائی بھی اقلیتی تعداد میں رہتے ہیں۔ مقامی زبانوں اور لمحے کے علاوہ گجراتی اور میراخی بھی بولی جاتی ہے۔ کسان پیشہ لوگ زیادہ ہیں۔

دامن اور دیو (Doman - Div)

یہ بھی وفاقی علاقہ ہے جو ۲۸ مربع میل پر مشتمل ہے۔ ہندو اکثریت میں اور تھوڑی تعداد میں مسلمان اور عیسائی ہیں۔ گجراتی زبان بولی جاتی ہے۔ دو اراضیاع پر مشتمل یہ علاقہ ہے۔ یہ بھی پر سکیزی نوا آبادی رہی ہے۔

گوا (Goa):

یہ ریاست ۲۵۰ میل بھی کے جنوب میں واقع ہے۔ اس کارقبہ ۱۳۲۹ مربع میل ہے۔ پرتگیزی نوآبادی کا حصہ تھا۔ ۱۹۸۷ء میں ریاستی درجہ حاصل ہوا۔ زرعی علاقہ ہے۔ عیسائی اور ہندو آبادی ہے۔ عیسائی پہلے پرتگیزی بولتے تھے اب انگلش اور مقامی زبان بولتے ہیں جبکہ ہندو مقامی اور مرathi بولتے ہیں۔ معاشری لحاظ سے یہاں لوگ افریقہ میں بھی آباد ہوئے۔ گوا کو پرتگیزی دار الحکومت ہونے کا اعزاز حاصل رہا ہے۔ ۱۹۶۱ء میں بھارت نے یہاں فوج داخل کر کے قبضہ کیا۔ بھارت اور پرتگیز کے درمیان اس پر تعلقات کشیدہ رہے۔ ۱۹۶۲ء میں یہ بھارتی یونین کا حصہ قرار پایا۔

گجرات:

ریاست گجرات میں مسلمانوں کی ریاستی سطح پر حالیہ نسل کشی کے بعد میں الاقوامی اہمیت اختیار کر چکی ہے۔ بھیرہ عرب کے ساتھ ہے۔ یہ ۵۶۸۵ مربع میل پر مشتمل ریاست ہے۔ سمندر سے ۱۰۰ میل کا فاصلہ ہے۔ گاندھی نگر دار الحکومت ہے جو کہ احمد آباد کے شمال کی طرف ہے۔ مہاتما گاندھی کا یہ علاقہ بھی تھا اور مرکز بھی۔ ٹیکٹائل کے لیے معروف ہے۔ کئی نسلوں کے لوگ آباد ہیں۔ شیڈولڈ ذات کی تعداد کافی ہے۔ گجراتی اور ہندی زبانیں ہیں۔ اکثریت ہندوؤں کی ہے مگر مسلمانوں کی بھی اچھی آبادی ہے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان فرقہ و رانہ کشیدگی اب یہاں کامعمول ہے۔ ریاست ۱۹۱۹ء میں تقسیم ہے۔ یہ بھی بھی صوبے کا حصہ تھا۔

مہاراشٹر:

بھی سے الگ ہونے والی دوسری ریاست جس کارقبہ ۸۰۹-۱۱۸ مربع میل ہے۔ بھی اس کا دار الحکومت ہے۔ بھی بھارت کا دروازہ ہے۔ بڑا شہر ہے۔ مرathi ادب پر یہاں کی تہذیب استوار ہے۔ مرathi ہی سرکاری زبان ہے جبکہ باقی تقریباً سب بھارتی زبانیں بولی جاتی ہیں۔ اکثریت ہندو، پھر مسلمان، بدھ، عیسائی، پارسی اور سکھ تمام مذاہب کے لوگ یہاں ملتے ہیں۔ ۵-۳ کی اوسط سے آبادی دیہاتی علاقوں میں آباد ہے۔ ناگپور، پونا، شعلہ پور دوسرے بڑے شہر

ہیں۔ اس کے ۳۰ اضلاع ہیں جو تین حصوں میں منقسم ہیں۔ ۱۹۴۷ء میں بھی پریڈ یونی سے بھبھی ریاست بنی۔ ۱۹۶۰ء میں یہ گجرات اور مہاراشٹر دوریاں استوں میں تقسیم کی گئیں۔

South India

اندھیا میں:

نکوبار جزائر جو ۳۱۸۵ مربع میل پر مشتمل ہے، برما اور انڈونیشیا کے درمیان ہے۔ ۱۸۷۲ء سے برطانیہ کے تحت تھا۔ یہ دونوں گروپس بعد میں بھارت کا وفاقی علاقہ قرار پائے۔ نگرینوں سل کے لوگ قبائل ہیں۔ اس جزیرے کے بارے میں کئی سفرناموں میں ذکر ہے۔ دوسری جنگ کے بعد یہ علاقہ ہندوستان کو ملا۔

آندھرا پردیش:

تلگوموجودہ ریاست ۱۹۵۶ء میں قائم ہوئی۔ تکوڑا زبان کے حوالے سے مطالبات نے یہ ضرورت پیدا کی۔ حیدر آباد اس کا دارالحکومت ہے۔ ۱۹۵۰ء میں علاقہ ہے۔ تلگو کے علاوہ اردو اور باقی تقریباً سبھی زبانیں بولی جاتی ہیں۔ ہندوؤں کی اکثریت اور مسلمان اور عیسائی اقلیت میں ہیں۔ تلگانہ اور رایلیسما میں مسلم اکثریت ہے۔

کرناٹک:

یہ ریاست ۱۹۴۷ء میں علاقہ ہے۔ ریاستی زبان کے علاوہ کئی دوسری زبانوں کے ساتھ بھیرہ عرب کے ساحل پر ہے۔ بنگلور اس کا مرکزی شہر اور دارالحکومت ہے۔ ۱۹۴۷ء سے میسور ایک ریاست کے طور پر اس علاقے میں تھی۔ موجودہ نام ۱۹۷۳ء میں دیا گیا۔ ڈراویڈین لوگ یہاں آباد ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ یہ لوگ اصلی ہندوستانی ہیں جن کا تعلق ڈگاسکر، ملایا اور سماڑا سے ہے۔ ہندو اکثریت میں ہیں۔ جبکہ جیمن بنت اور بدھ مت اس علاقے میں کافی موثر ہیں۔ اس کے بعد مسلمان اور عیسائی آتے ہیں۔ معروف شہروں میں میسور کے علاوہ ۹ مزید شہر ہیں۔

کیرالہ:

یہ چھوٹی سی ریاست ۱۹۵۶ء میں ۱۵۰۰۵ مربع میل پر قائم ہوئی۔ یہ تعلیمی لحاظ سے ترقی یافتہ ریاست ہے۔ زبان زیادہ ملائیم ہے۔ ڈراویڈین نسل کے لوگ ہیں۔ ہندوؤں کے علاوہ مسلمان اور عیسائی بھی ہیں۔ غالباً واحد علاقہ ہے جہاں یہودی تحوزی تعداد میں موجود ہیں۔

لخنڈ ویپ:

یہ وفاقی علاقہ ہے۔ ۱۲ مربع میل پر مشتمل ہے۔ زیادہ تر مسلمان ہیں۔ ۱۹۵۶ء میں ہی یہ وفاقی علاقہ بن گیا تھا۔

پانڈی چیری:

بھی وفاقی علاقہ ہے جو ۱۹۶۲ء میں بنا۔ یہ فرانسیسی کالونی تھی۔ ۱۹۰۰ مربع میل رقبہ ہے۔

تامل ناڈو:

۵۰۲۱۵ مربع میل رقبے پر مشتمل یہ ریاست بھارت کے جنوب میں واقع ہے۔ ڈراویڈین نسل اور زبان بھی وہی ہے اور بھارت کے ساتھ مزاحمت کر رہے ہیں۔ ہندی سرکاری زبان ہے۔ ذات کا نظام بھی مضبوط ہے۔ تملکوزبان بھی بولی جاتی ہے۔ ہندو، مسلمان، عیسائی اور جین متن مدھب پائے جاتے ہیں۔

ٹی ریاست کا تصور نیا نہیں ہے۔ اس کی تاریخ قبل مسح سے دستیاب ہے۔ انسانیکلوویٹیا برٹنیکا کے مطابق اس کا تصور ۸۰۰-۱۰۰۰ قبل مسح سے ملتا ہے۔ ٹی ریاست کا تصور یہ ہے کہ ایک شہر اور اس کی ملحقة آبادی و علاقہ سمیت ایک آزاد و خود مختار حکمرانی ہو جس میں یہ ٹی ایک مرکز کا کردار ادا کرتا ہے۔ یہ ریاست سیاسی، معاشری اور تہذیبی راہنمائی کا فریضہ سر انجام دیتی ہے۔ البتہ اس کی ابتداء اور طریقے پر اختلافات ہیں۔

یہ اصطلاح برطانیہ میں انیسویں صدی کے آخری عشروں میں سامنے آئی جو اپنے دور کے

بڑے شہروں یونان فینو کے Phoenicia اور اٹلی کے لیے لکھا گیا۔ جس کے بعد یہ اصطلاح موجودہ زمانے کے حالات پر بھی کافی جگہوں پر لاگو کرنے کی نشاندھی کی گئی۔ یہ زیادہ تر بیسویں صدی کے آخری عشروں میں ہوا۔

ٹی ریاست کی کامیابیوں اور ناکامیوں کا تذکرہ ہے۔ تاریخ میں آگے چل کر اس طرح کی بہت سی ٹی ریاستیں وجود میں آئیں، کامیاب ہوئیں مگر پھر کسی اور کے ہاتھوں مغلوب ہو گئیں۔ کسی بڑی ریاست کی فوجی طاقت کے مقابلے میں ٹی ریاست کا موازنہ درست بھی نہیں لگتا۔ گیارہویں صدی میں بھی ان ریاستوں کا وجود ملتا ہے۔ شہروں کے گرد یوار بنانا اس کی حفاظت کا ایک طریقہ رہا ہے جسے قلعہ بندی کہا جاتا ہے۔ یہ یورپ اور ایشیاء اور باقی دنیا میں معروف طریقہ رہا ہے جس کے آثار بھی تک دنیا میں پائے جاتے ہیں۔

یورپ میں نئے ناظر میں اس پر بحث شروع ہو چکی ہے۔ یہ درست ہے کہ ماضی اور حال کا فاصلہ گہرا فاصلہ ہے۔ تب ذرائع نقل و حمل بہت ست تھے اور ایک برابر عظم کی خبر دوسرے برابر عظم میں متواتر بعد پہنچتی تھی۔ اس لیے ٹی ریاستیں کافی عرصہ لوگوں کو سہولتیں مہیا کرتی تھیں۔ قلعہ بندی ایک حفاظتی تدبیر رہی ہے لیکن سرکش قویں میں حملوں اور قبضوں کے حصول میں تب بھی سرگردان تھیں اور آج بھی ہیں۔ اس مہم جوئی کا کتنا بڑا مقصد رہا ہے تاریخ بھری پڑی ہے لیکن جنگ و جدل کا یہ سلسلہ رکا نہیں، طریقہ کار بدل گیا ہے۔ یہ جنگ و جدل، یہ باقی رہنے اور دوسروں کو مٹانے کی جدوجہد تب بھی تھی اور اب بھی ہے۔ تب دنیا، دنیا تھی اور اب دنیا ایک گلوبل گاؤں ہے۔ اس فرق کے باوجود انسان نے کیا پایا ہے؟ یہ سوال ابھی باقی ہے۔

دنیا میں بھوکے انسانوں کی تعداد زیادہ ہے۔ یہ تسلیم شدہ ہے۔ دنیا میں ظلم جتنا ان ماڈرن صدیوں میں انسان پر ہوا ہے، ماضی میں نہیں ہوا تھا۔ غلامی تب بھی طاقت وروں کے ہاتھوں انسان کا مقدر تھی اور اسی طرح آج بھی مقدر ہے۔ صرف انداز جدید ہے۔ ٹی ریاست کا موجودہ تصور انسانی شعور کی ترقی سے عمرانی نقطہ نگاہ سے زیر بحث لایا جا رہا ہے۔ سیاسی لحاظ سے حکمرانی کا شعور، معاشی لحاظ سے طاقت کی اہمیت اور تہذیبی لحاظ سے تشخیص کی پہچان انسان کے ہاں زیادہ تیزی سے بیدار ہوئی ہے۔ جبکہ انسان آج بھی یہ چیزیں دوسروں سے مخاصمت کی طرز پر شیئر کرنے کے لیے تیار نہیں ہے جس کا نتیجہ کسی شہر کے باسی تو بھکتیں گے، ساری قوم بھی بھکتی ہے اس کے پس منظر میں وجود ہات پرانی ہیں۔ وہ مذہبی، تہذیبی، نسلی، معاشی، سیاسی اور انسانی ہو سکتی ہیں۔

گجرات میں مسلمانوں کی ریاستی سطح پر قتل و غار بھری کے بعد دنیا میں ٹھی ریاست کا مسئلہ زیر بحث آیا ہے کہ ایسی صورت میں جب ایک ریاست کی کیونٹی کی زندگی، عزت اور عقیدے کی حفاظت کرنے کے بجائے ایک فریق بن جائے اور ثابت ہو جائے تو اقوام عالم کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ اس ملک کے حق حکمرانی کو اس مخصوص علاقے یا شہر پر موقوف کر دے اور اسے ایک ٹھی ریاست قرار دے دے جو علاقائی لحاظ سے تو اس ملک کا حصہ ہو گی مگر حکمرانی موقوف ہو جائے گی اور ایک آزاد شہری ریاست قرار پائے گی اور جوزمانہ کی مردی جہ سیاسی و معاشی پالیسیوں کے تحت نظم چلائے گی۔

انسان نے اس پر نئے نتاظر میں دوبارہ سوچنا شروع کیا ہے۔ سوال یہ ہے کہ
- کیا انسان کا عمرانی شعور اس سطح پر آگیا ہے کہ وہ مذاہب، تہذیبوں، نسل، قبائل، زبان اور رنگ سب کے سب کو انسان کی ترقی اور شعور کا سامان تسلیم کرے۔
- کیا انسان عمرانی طور پر دوسروں کو نقصان پہنچائے بغیر دوسروں کے ساتھ رہنے پر تیار ہو چکا ہے۔

انسان ان اوصاف سے ابھی محروم ہے۔ اسے ابھی جدوجہد جاری رکھنی ہے۔ ٹھی ریاست ایک نصب العین ہو سکتا ہے۔ تصور اقبالستان کا معنی یہ نہیں کہ بھارت تباہ و بر باد ہو اور نہ کبھی اقبال نے سوچا۔ ٹھی ریاستیں بھارت میں مقیم اقلیتوں کو زندگی کی دوڑ میں شامل رہنے کے لیے تیرارستہ دے سکتی ہیں۔ بھارت نے علاقائی سطح پر ۲۰ ریاستیں قائم کر کے ایک اچھی انتظامی کوشش کی ہے لیکن یہ آمریت کو اقلیت کے اتحصال سے نہیں روک سکی ہے۔

حوالہ

۱۔ اقبال احمد صدیقی، قائد اعظم تقاریر و بیانات، جلد دوم، صفحہ ۳۹۹

۲۔ *The New Websters International encyclopedia*، پانچویں ریڈیشن میں

بھارت کا رقمبہ ۱۲۶۹، ۱۲۹۱ امریجع میل یا ۲۶۳، ۲۸۷، ۲۶۳، ۲۸۷ امریجع میل کلومیٹر لکھا ہے۔ ص ۵۲۲

۳۔ بھارت کی جغرافیائی تفصیلات کا بڑا مأخذ، انسائیکلو پیڈیا بڑیں کا، جلد ۲۱ ہے۔

نصب العین کے تعین میں لازمی عناصر... ضرورت و اہمیت

نجات دیدہ و دل کی گھڑی نہیں آئی
چلے چلو کہ وہ منزل ابھی نہیں آئی
(فیض احمد فیض)

امید اور ناامیدی جسم انسانی یا جسد قومی میں ایک ساتھ چلتی ہیں۔ عروج میں امید کا پلہ بھاری ہوتا ہے اور زوال میں ناامیدی چھائی رہتی ہے۔ عروج ایک محركہ نصب العین کی بنیاد پر مسلسل کوشش اور جدوجہد سے حاصل ہوتا ہے اور جب نصب العین کی حرکت سست پڑ جائے، جس تو اور جدوجہد میں کمی واقع ہونی شروع ہو جائے۔ سماجی، معاشی، سیاسی اور تہذیبی لحاظ سے جاری نہ کو صحیح سست میں آگے بڑھانے یا متبادل لانے میں ناکامی ہو تو وہ زوال کی راہ پر ڈال دیتی ہے اور جب زوال اپنا آغاز کرتا ہے تو کینسر کی طرح پتہ نہیں چلنے دیتا اور جب پتہ چلتا ہے تو بہت دیر ہو چکی ہوتی ہے۔ اس کے باوجود جب قوم کو یہ شعور آ جائے کہ وہ زوال آمادہ ہے اور اسے مٹانا نہیں ہے تو اذہان قومی دوبارہ حرکت میں آنے شروع ہو جاتے ہیں۔

ناامیدی اور زوال آمادگی کے آثار نمایاں ہونے کی بنیادی وجہ نصب العین کے شعور اور اس سے وابستگی سے دوری ہوتی ہے۔ حرکت کے لیے چیلنج درکار ہوتا ہے اور چیلنج جب طاقتور نہ رہے تو حرکت سست پڑ کر راہ زوال اختیار کر لیتی ہے، فکر جو چیلنج کا احساس دلاتی ہے چیلنج کے کمزور ہونے سے جمود کا شکار ہو جاتی ہے۔ قوت جو چیلنج سے نہنئے کا سامان ہے، بغیر جاندار فکر کے پیدا نہیں کی جاسکتی اور حکمت عملی تو چیلنج، فکر اور قوت کی موجودگی کے بعد مرتب ہوتی ہے۔ اهداف کا

تعین ایسا مرحلہ ہے جو چیلنج کی نوعیت، فکر کی جہت اور قوت کی ضرورت پیدا کرتا ہے۔ ۱۸۷۶ء چیلنجر کی مہم (Challenger Expediton) برطانوی سائنسی مہم کے لیے سفری جہاز کا نام "چیلنجر" رکھ کر دراصل مقاصد کے شعور اور اس کے حصول کے مقام و بلندی کی نشاندہی تھی۔ جبکہ NASA امریکن خلائی پروگرام کی ۳ میں سے ایک خلائی شش کا نام "چیلنجر" رکھا گیا۔ اسلامی ادب میں عمومی طور پر استعمال ہونے والا لفظ "دعوت" ہے جو صرف دعویٰ پہلو کو مگر مزاحمتی تصور کے بغیر اجاگر کرتا ہے۔ اردو میں "مقابلے کی دعوت" سے مناسب مفہوم کا اظہار ہوتا ہے۔ اس لیے نا امیدی اور زوال آمادہ رجحانات کو روک کر دوبارہ عروج کی راہ پر پر جوش طریقے سے گامزن کرنے کے لیے تازہ چیلنج، تازہ فکر، تازہ قوت اور تازہ حکمت عملی لازمی عناصر ہیں۔

۱۔ تازہ چیلنج:

تازہ چیلنج جو حالیہ برسوں میں تیزی سے ابھر کر سامنے آیا ہے، وہ مسلمانوں کو خوفزدہ کر کے عدم تحفظ سے دوچار کرنا ہے۔ "خوفزدہ کر کے عدم تحفظ کا شکار کرنا" یہ معمولی بات نہیں ہوتی۔ یہ غیر معمولی بات ایک غیر معمولی حکمت عملی سے وابستہ ہوتی ہے۔ اس طرح کی کیفیت ہی قوموں کو زوال آمادگی آثار سے لامع رکھتی ہے۔ کسی قوم کو شکست دینے یا مٹانے کا اس سے بہتر اور غیر محسوس انداز ابھی تک دریافت نہیں ہوا۔ مسلمانوں کو خوفزدہ کر کے عدم تحفظ کا شکار کرنے کا بندوبست ایک سطح پر نہیں ہو رہا۔ یہ کئی سطحوں اور جہتوں سے ہو رہا ہے۔ ان سطحوں میں چند کی نشاندہی مقصود ہے۔

ہندوستان کی سطح پر تازہ تاریخی چیلنج:

تازہ تاریخی چیلنج بھارت میں BJP کی انتخابی مقبولیت اور پھر ان کا حکومت میں آ کر سرکاری سرپرستی میں "ہندو اتا" یعنی ہندو قومیت کو نصب لعین قرار دینا ہے، جیسا کہ پچھلی سطھوں میں "ہندو اتا" کی تاریخ کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ اسے پہلے سرکاری سرپرستی حاصل تھی اور نہ عوامی تائید حاصل تھی۔ BJP کے دور میں اسے سرکاری سرپرستی بھی حاصل ہوئی جیسے گجرات کے وزیر اعلیٰ نریندر مودی کا مسلمانوں کی نسل کشی میں با قاعدہ سرپرستی کرنا اور واچپائی اور ایڈوانی کا اس

کے خلاف کارروائی سے انکار ایک بڑی اور مین الاقوامی طور پر تسلیم شدہ مثال ہے۔ یہ تازہ چیلنج شدید تر ہے۔ یہ چیلنج اکیلے مسلمانوں ہی کے لیے نہیں ہے۔ دوسری مذہبی اقلیتوں مثلاً عیسائیوں، بدھوں، جین مت اور سکھ مت کے لیے بھی کم تر نہیں ہے بلکہ ہندو شودر یا شیڈ ولڈ کا سٹ یعنی کم درجہ کے انسانوں کے لیے بھی یہ چیلنج شدید تر ہے۔ سب کیلئے ”ہندو اتا“ کے دربار عالیہ سے یہ حکم شاہی صادر ہو چکا ہے کہ ہندو ازام قبول کرو یا مرنے یا بھارت چھوڑنے کے لیے تیار رہو۔ یہ حکم باقاعدہ ایک تاریخی پس منظر کا حامل ہے جسے BJP نے ریاستی سرپرستی دی۔

مغل حکومت کے مکمل خاتمے کے ساتھ ہی مسلمانوں کی زبان، ان کا طرز زندگی، ان کی زمین اور عسکری قوت سب خطرات کی زد میں تھے۔ اگلی نصف صدی تذبذب اور بغیر کسی رہنمائی کے گزری جس میں سوائے سر سید احمد خان کے کسی مسلم رہنماؤ کو ابھرنے کا موقع ہی نہ مل سکا۔ گویا یہ زمانہ حواس درست کرنے اور غور و فکر کرنے کا زمانہ ہے۔

۱۹۵۷ء کے بعد تین بڑی قوتیں ابھر کر سامنے آ گئیں جن کے عزائم مختلف تھے۔ مسلمان ماضی کی شاندار روایات کی واپسی و احیاء کو دیکھ رہے تھے۔ انگریز سلطنت مستحکم کرنے کی فکر میں تھے اور ہندو اس انتظار میں تھے کہ وہ اقتدار کو صدیوں بعد واپس حاصل کریں۔ ایسی صورت میں ہندو اور مسلم متوازی چلنے والے ان دو مذاہب کے لوگ اکٹھے نہیں چل پا رہے تھے کیونکہ مسلمان ایک خدا پر یقین رکھتے تھے جبکہ ہندوؤں کے ہاں کوئی خدا نہیں۔

اسلام سماجی طبقات کو تسلیم نہیں کرتا جبکہ ہندو سماج کی بنیاد ذات کی تقسیم پر ہے۔

اسلام کے عقائد سیدھے سادے ہیں اور انہیں سماجی رویے میں یکساں حیثیت حاصل ہے جبکہ ہندو انسان کو پاک اور ناپاک کی کی نظر سے دیکھتا ہے۔

اس کے باوجود کہ ایک جیسی نسلیں دونوں مذاہب میں پائی جاتی ہیں۔ ایک جیسی تہذیب و زبان کا اشتراک بھی موجود ہے۔ خوراک اور لباس بھی قریب قریب ملتے جلتے ہے۔ اس قربت اور اکٹھے رہنے کے باوجود ایک دوری موجود رہی ہے اور یہ دوری دن بدن گہری ہوتی جا رہی ہے۔

۲۔ تازہ چیلنج میں ہندو نیشنلزم کے مقاصد حاصل کرنے کی خاطر مسلمانوں کے تاریخی و تہذیبی

نقوش مثانے کی کارروائیوں کا آغاز ہو گیا ہے جن میں سے ایک زبان کا مسئلہ ہے۔ زبان انسان کے اظہار کا معاملہ ہے جس کی بناء پر اسے حیوان ناطق کہا گیا۔ زبان اپنے حقیقی معنوں پر ثابت ہوتی ہے۔ زبان نفرت سکھانے کے عمل کا ساتھ نہیں دیتی۔ یہ ہم

ہیں جو زبانوں کو بھی اس لڑائی میں لے آئے ہیں۔ البتہ جو حقیقت ہے وہ یہ ہے کہ زبان تہذیبی بنیادوں اور اطہار میں اہم مقام رکھتی ہے۔ مسلمان و قفے و قفے سے ہندوستان میں داخل ہوتے رہے اور ان کی زبان مختلف تھی۔ البتہ حکمرانوں کا طبقہ زیادہ تر فارسی علاقوں سے رہا ہے، اس لیے سرکاری زبان فارسی قرار پائی۔ ہندوستان میں سنکرت یا ہندی یا مقامی زبانیں جو بھی تھیں، وہ اس وجہ سے نظر انداز نہیں کی گئیں کہ مسلمان حکمرانوں کو ان سے نفرت تھی بلکہ اس وجہ سے کہ انہیں وہ آتی نہیں تھیں اور نہ ہی اس حد تک تحریری ذخیرہ اس میں محفوظ تھا، جتنا فارسی میں، جو ذخیرہ تھا بھی وہ مسلمانوں کے مذہبی عقائد سے متعلق نہ تھا۔ لامحالہ حکمرانوں نے فارسی کو سرکاری زبان قرار دیا جس سے بہر حال انہیں حکمرانی میں آسانی تھی۔ یہی طریقہ ہائے عمل انگریز نے آ کر اختیار کیا۔ حالانکہ اس وقت تک ہندی کے ساتھ اردو بھی ترقی پذیر تھی۔ یہ حقیقت ہے کہ باہر سے آئے ہوئے حکمرانوں کو مقامی زبان اختیار کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی کیونکہ اس سے انہیں فائدہ نہیں ہوتا۔

موجودہ دور میں ”ہندو داتا“، اردو کو محض اس لیے مٹانے پر کمرستہ ہے کہ یہ مسلمانوں کی زبان ہے۔ حالانکہ بولنے والے ہندو بھی ہیں۔ ویسے بھی ہندی اور اردو بولنے میں اتنی مختلف بھی نہیں۔ رسم الخط علیحدہ ہے۔ اردو نے سنکرت، ہندی، فارسی، عربی اور مقامی زبانوں سے جنم لیا اور بعد ازاں انگریزی بھی اس میں شامل ہو گئی۔ بہر حال اردو زبان کا کمزور ہونا یا امانتا مسلم ہندی تہذیب کے ایک نقش کا مٹانا ہے۔ اس لیے مسلمان اس کے بارے میں محتاط ہیں۔ اطہر فاروقی (دہلی) سے جنگ لنڈن میں ”ہندوستان میں اردو کا مخدوش مستقبل اور مسلمان“ کے نام سے شائع ہو، اجس میں لکھتے ہیں۔

”ہندوستان میں اسلام کے لیے بھی حالات بہت حوصلہ افزاء نہیں ہیں لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ مسلمان مذہب سے دست بردار ہو جائیں۔ بالکل اسی طرح اگر اردو پڑھ کر روزگار نہیں مل سکتا تو بھی اردو کو نہیں چھوڑا جا سکتا۔ اگر بغور مشاہدہ کریں تو معلوم ہو گا کہ اردو کے عام ہندوستانی مسلمان کی نفیات اسی ثابت فکر کے تابع ہے۔ تعلیم ہی کیا مسلمانوں کے تمام خصوصاً تہذیبی اور مذہبی مسائل سے ماضی کے رشتے ہر روز ایک نئی پیچیدگی سے روشناس ہو رہے ہیں۔“
۳۔ بھارت میں BJP کی حکومت آنے کے بعد نہ صرف نصاب کو ”ہندو داتا“ یعنی ہندو

نیشنلزم کے تحت نئے سرے سے لکھا اور پڑھایا جا رہا ہے بلکہ ہندوستان کی پوری تاریخ کی توجیہ ہندو مسلم تعلقات کے حوالے سے سرکاری سطح پر ترتیب دینے کیلئے ادارے قائم کیے گئے۔ ظاہر ہے جب ہندو مسلم تعلقات کی خلیج میں مزید اضافہ "ہندو اتا" کا عین مقصد ٹھہرے گا تو رواداری اور ہم آہنگی کا سوال بے معنی ہو کر رہ جائے گا۔ اس پر تفصیلی مطالعے کیلئے اردو میں صبح پبلشرز کی کتاب دیکھی جاسکتی ہے۔ ۳

مسلم ہندی تہذیب و تمدن کے کئی نقوش بھارت کی سر زمین پر موجود ہیں۔ ان کو منانے کے باقاعدہ ایجنسٹے پر عمل شروع ہو چکا ہے۔ ۶ دسمبر ۱۹۹۲ء کو بابری مسجد کا گرا ایما جانا اس کا آغاز ہے۔ بابری مسجد صرف ایک قدیم مسجد کا گرا کر اس کی جگہ ایک مندر کی تعمیر ہی کا مسئلہ نہیں۔ اینٹوں اور گارے کی ایک عمارت ہی نہیں گری بلکہ مسلمانوں کے تمدن کا ایک نقش زمین بوس ہوا ہے۔ تاریخ کا ایک دور منانے کی سعی ہے۔ قدیم مساجد اور قدیم تاریخی یادگاروں کو منانے کی باقاعدہ ایک لست جاری کی ہے جس پر بتدریج عمل ہو گا۔ اس مسلم دشمنی کی ایک جھلک حیدر آباد (بھارت) سے ایک اردو روزنامہ "سیاست" کے ایک مضمون میں یوں سامنے لائی گئی ہے۔

خبر کے مطابق اس میں کوئی دورائے نہیں ہو سکتیں کہ ۱۹۸۰ء کی دہائی میں بابری مسجد کا تالا کھولے جانے کے بعد سے اس ملک کے متوسط طبقے کی اکثریت کو ہندو اتا سیاست اور مسلم دشمنی میں کافی مزہ آنے لگا تھا۔ یہ وہ سیاسی دور تھا کہ جس دور میں ہندوستانی مسلمان کو ہندو سماج کا ایک دشمن بننا کر پیش کیا گیا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ جس میں ہندوستانی اخبارات کے ذریعہ یہ باتیں پھیلائی گئیں کہ ہندوستانی مسلمان دراصل "بابر کی اولاد ہیں۔ او ما بھارتی اور اشوک سنگھل جیسے لوگوں کو اس قسم کی بے ہودہ باتیں کرنے کے باوجود کوئی کچھ نہ کہہ سکا۔ اس کے برعکس او ما بھارتی اور اشوک سنگھل جیسے لوگ "ہندو اتا سیاست" کے بڑے ہیر و شمار کیے جانے لگے جنہیں کو ہندوستانی متوسط طبقے نے بڑی عزت بھی دی یہاں تک کہ اب او ما بھارتی خود وزیر اعظم اٹل بھارتی واجپائی کی کابینہ کی ایک رکن ہیں۔ الغرض ۱۹۸۰ء کی دہائی سے ابھی حال تک ہندوستان کے متوسط طبقے میں "مسلم دشمنی" پسند کرنا ایک فیشن بن گیا تھا اس لیے ہر وہ شخص جو مسلمانوں کے خلاف بیان بازی کرتا تھا، انہیں اچھا لگنے لگا تھا جبکہ مہاراشٹر کے متوسط طبقے میں تو شیواجی کے وقت سے ہی مسلم دشمنی کا رنگ کافی گہرا رہا ہے۔

بھارت میں آئے دن مسلم ہندو فسادات بمبئی مسلم فسادات کے گھرے اثرات اور حال ہی میں شیوینا کے ایک مبرآسمبلی کی طرف سے معروف فلمی اداکار دلپ کمار کو "پاکستانی" کہہ کر اسے تنازعہ بنانا اور ۲۹ مارچ ۱۹۹۹ء کو مسلمانوں کو عید الاضحی منانے پر حکمی کہ یہ دن جیں دھرم کے باñی بھگوان مہا ویر کا جنم دن ہے اور تمام سکولوں میں بندے ماترم کا گایا جانا لازمی قرار دینا یہ سب اس خصوصی ایجندے پر عمل درآمد کا ایک حصہ ہے۔ بھارت کے سیاسی و سماجی منظر پر گھری نظر رکھنے والوں سے یہ بات اب پوشیدہ نہیں رہی کہ وہاں مسلمان اور دوسری اقلیتیں اگر اپنے تحفظ اور بقاء کیلئے کمر بستہ نہ ہوں گی تو انہیں ہندو بننا پڑے گا یا امرنا پڑے گا یا بھارت چھوڑنا ہوگا۔

۵۔ بھارت کی ایک اور بڑی اقلیت عیسائیوں پر حالیہ حملوں، ان کا مذہب تبدیل کرانے کی جری طور پر بڑے پیمانے پر کوششیں اور عیسائی مشنریوں پر حملے اور قتل ایک نیا منظر ہے اور یہ "ہندو اتا" کے ایجندے پر عمل کا کھلا اور واضح ثبوت ہے۔

تازہ چیلنج ۱۱/۹ کا واقعہ نئی تاریخ رقم کرنے کا نقطہ آغاز ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ "واقعہ" بھول جاتا ہے مگر اس کے نتائج کی منصوبہ بندی کرنے والے نتائج حاصل ہونے تک واقعہ کو بطور ایک عامل کے استعمال کرتے ہیں۔ یہ ایک مسلمہ رائے ہے کہ امریکہ کے ولڈریڈ سنٹر کے انہدام سے مسلمانوں کو کچھ لیتا دینا نہیں تھا۔ ان طیاروں میں کیا کوئی مسلمان یا کوئی بھی شخص سوار تھا؟ یہ ایسا سوالیہ نشان ہے جو "سوالیہ" ہی رہے گا۔ البتہ اس واقعے کا سارا رد عمل اور نتیجہ صرف اور صرف مسلمانوں کو دبانے، خوفزدہ کرنے اور قتل کرنے سے وابستہ ہے۔ صلیبی جنگ کا نعرہ امریکی صدر با قاعدہ تحریری طور پر فوج کو خط لکھ کر کرتا ہے۔ صلیبی جنگ عیسائی دنیا نے مسلم دنیا کے ساتھ لڑی ہے۔ اب تک کی کارروائیوں نے یہ بات ثابت کر دی ہے کہ یہ واقعہ امریکہ کی اس منصوبہ بندی سے تعلق رکھتا ہے جو اس نے بہت پہلے نوآبادیاتی نظام (اپیریلز) کی اکیسویں صدی کے آغاز پر نئے انداز سے اور آئندہ پچاس سال کیلئے ترتیب دیئی تھی۔ پچھلے پچاس سالوں میں مسلمانوں نے بیداری کے حوالے سے جو تھوڑا بہت شور اور کسی قدر طاقت و فکر حاصل کی تھی اس کو دوبارہ ناقابل مزاحمت حد تک لے جانا تھا۔ نتائج اس کی تائید میں ہیں۔ افغانستان پر چڑھائی، عراق پر قبضہ، ایران و شام پر دباؤ اور یورپ میں مسلمانوں کو خوفزدہ کرنا یہ سارا کچھ ایک ہی کہانی سے وابستہ ہے۔

۱۱/۹ کے واقعہ کا ایک اور سب اسلام کا یورپ اور امریکہ میں تیزی سے پھیلنا تھا۔ اس کو روکنے کے لیے ضروری تھا کہ مسلمانوں کو ”دہشت گرد“ اور اسلام کو برائی کی جڑ قرار دیا جائے۔ ہنگنگن نے نشاندہی کی ہے کہ مسلمانوں کی آبادی تبدیلی مذہب اور تولید سے پھیلتے ہوئے ۲۰۰۵ء میں سب سے زیادہ ہو جائے گی۔ ۱۱/۹ اور اس کے بعد ان سطور کا مصنف برطانیہ میں انگریز نوجوانوں کے مذہبی حوالے سے بدلتے ہوئے تیور کا مشاہدہ کر چکا ہے جبکہ قبل از اس انگریز نوجوانوں میں سے شاید ہی کوئی کسی مذہب سے وابستگی کا اظہار کرتا تھا۔ (۳)

۱۱/۹ ساری دنیا میں مسلمانوں کے لیے ایک کھلا چیلنج ہے لیکن اس کا برعظیم پاک و ہند کے مسلمانوں پر کئی لحاظ سے گہرا اثر پڑا ہے۔ افغانستان کی حکومت ختم کر کے مسلم دشمن حکومت لائی گئی ہے جس نے پاکستان اور بھارت کے مسلمانوں کے لیے نئی مشکلات پیدا کر دی ہیں۔ پاکستان میں سیاسی حکومت کو بلا جواز باہر پھینک کر فوجی آمریت کو قائم کر کے اپنے تابع کر رکھا ہے۔ بھارت کو دہشت گردی کی جنگ میں پاٹنہ بنا کر مسلمانوں کو دبانے کا حوصلہ دیا ہے۔

تازہ چیلنج..... رے لنڈن کا واقعہ

۱۱/۹ کے واقعہ کی اگلی کڑی ہے۔ یہ واقعہ ۱۱/۹ کے رد عمل کو زندہ رکھنے اور آگے بڑھانے کی حکمت عملی بھی ہے اور امریکی مفادات کو روکنے اور اس میں زیادہ حصہ دار بننے کے لیے برطانیہ کی نئی منصوبہ بندی بھی ہے۔ غالباً برطانیہ نے دوبارہ دنیا میں آگے بڑھنے کا فیصلہ کر لیا ہے اور اس واقعہ کی بنیاد پر یورپ کی قیادت ہاتھوں میں لینے کی منصوبہ بندی کی ہے جبکہ امر واقعہ یہ ہے کہ یہاں بھی عمل اور رد عمل کی ساری کہانی کا مرکزی کردار مسلمان ہی ہیں۔

رے کا واقعہ اس لیے بھی گہرے اثرات کا حامل ہے کہ مسلم دنیا اور خصوصی طور پر برعظیم پاک و ہند کے مسلمانوں کی ایک خاطر تعداد طویل عرصے سے برطانیہ میں مقیم ہے اور برطانیہ کے مسلمان انتہائی خاموشی سے نشأۃ ثانیہ کی جدوجہد میں قابل قدر اور موثر کردار ادا کر رہے ہیں یہ ایک ثابت انداز تھا۔ اس کے علاوہ زر مبادله کی صورت میں مالی امداد غربت کو کم کرنے کا باعث بن رہی تھی۔ برطانیہ میں مسلمانوں کی بلا وجہ پکڑ دھکڑ چھاپے اور گولی مارنے کے احکامات محض مسلمانوں کو خوفزدہ کر کے ان کو اپنے نصب العین کے لیے کام کرنے سے روکنے کی حکمت عملی

ہے۔ عام مسلمانوں کو انتہاء پسند، قشید مسلم یا غیر مسلم افکار سے کبھی کوئی غرض نہیں رہی۔ مسلم نوجوانوں میں انتہاء پسند نہ بھی جنونیت پیدا کرنے میں بھی عام مسلمانوں کا کوئی دخل نہیں رہا۔ یہ نہ بھی جنونیت پسندی کی تربیت چند عرب علماء کی طرف سے برطانوی حکومت کی زیر پرستی ایک طویل عرصے سے دی جا رہی ہے جو نوجوانوں کو برطانوی معاشرے سے کاث کر کسی خیالی یا ہوائی جنت میں لے جا کر چھوڑ آتے ہیں جہاں سے ان نوجوانوں کی واپسی کی ہر راہ تشدید اور مایوسی سے گزر کر آتی ہے کیونکہ ان کا متصور اسلامی معاشرہ زمین پر انہیں کہیں نظر نہیں آتا تو مایوسی بڑھ کر خودکشی پر آ جاتی ہے جبکہ اس مایوسی میں مزید تیل ڈالنے کیلئے جموں و کشمیر میں بھارتی درندگی، فلسطین میں اسرائیلی بربادیت، افغانستان و عراق میں امریکی دہشت گردی اور قتل اور پرنس اور الیکٹرانک میڈیا ہر آن اس کو ہوادیتے ہیں۔

۷/۷ کا واقعہ اس تصنیف کی تحریر کے تکمیلی دور میں ہوا ہے۔ اس لیے اس کے عمل اور رد عمل کی نقاب کشائی وقت گذرنے کے ساتھ ہوتی جائے گی۔

مایوسی: نتیجہ خیز بڑا چیلنج

مخالفانہ واقعات مایوسی پیدا کرتے ہیں اور ثابت واقعات امید پیدا کرتے ہیں۔ بڑے واقعات بڑے گھرے اثرات کے حامل ہوتے ہیں لیکن ان واقعات کا فیصلہ کن حملہ قوائے ڈھنی کو مض محل کر کے مایوسی کے گھرے سمندر میں پھینکنا ہوتا ہے جہاں سے واپسی کا راستہ کبھی کسی کو نہیں ملا۔ مایوسی موت کو جنم دیتی ہے جبکہ مردہ دوبارہ زندہ نہیں ہوتا۔ اور پرندگوہ واقعات کو اپنی منصوبہ بندی سے برپا کر کے اور پھر اس کا سارا ملبہ مسلمانوں پر ڈال کر خوف و دہشت اور قتل و غارت گری کا بازار گرم کرنے کا بہانہ تلاش کیا گیا ہے تاکہ مسلمانوں کو مایوسی کے گھرے سمندر میں پھینک دیا جائے۔ اس لحاظ سے ”مایوسی“ بڑا چیلنج ہے۔ واقعات کے رد عمل سے پہنچا ایک معاملہ ہے جبکہ ”مایوسی“ کا توڑا اس سے بڑا معاملہ ہے۔

۲۔ تازہ فکر

فکر کسی عمل کی ابتداء ہے۔ اس کے دو پہلو ہوتے ہیں۔

ایک یہ کہ فکر کا ماضی کے تسلسل سے کتنا گھر ارشتہ ہے کیونکہ مجرد فکر اہم تو ہو سکتی ہے مگر سماج میں عمل و نتائج سے عاری ہونے کی بنا پر تو اتر و تسلسل کے معیار پر پورا نہیں اترتی۔ جبکہ فکر کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ آپ اپنی چشم بینا سے وقت کی چڑھتی دوپہر میں بیٹھ کر ایک قسم کی کیفیت مراقبہ و تفکر سے کس نتیجہ پر پہنچتے ہیں۔ آپ کا نتیجہ غور و فکر دراصل بنیادی اہمیت کا حامل ہے۔ فکر جو ماضی کا تسلسل ہوتی ہے اس کی قریب ترین کڑیاں تلاش کرنا مشکل نہیں ہوتا۔ مشکل امر یہ ہوتا ہے کہ اس فکر کا ایک دور نتیجہ خیز ہے تو کیا نصف صدی یا ایک صدی بعد بھی اس سے نتیجہ خیزی کے عمل میں استفادہ کیا جاسکتا ہے۔ یہ مشکل گتھی سمجھانے کا عمل آپ کے غور و فکر کی صلاحیت اور طاقت سے وابستہ ہو جاتا ہے جیسے ہمارے فکری تسلسل کی آخری مستند اور نتیجہ خیز کڑی علامہ محمد اقبال ہیں۔ کوئی اور اقبال پیدا نہیں ہوا تو کیا اس آخری مستند کڑی کو وقت جدید کے تقاضوں سے نہنے کیلئے دوبارہ نتیجہ خیز صورت میں لا سکتے ہیں؟ کیا یہ ممکن ہے؟ یہ بات ہمارے غور و فکر کی مقاضی ہے۔

افکار کے جھمیلے بہت ہیں۔ خصوصاً ان پڑھ اور غیر علمی معاشرے کا یہ زیادہ المیہ ہے۔ بلند تفکر تک جب ہر کوئی پہنچ نہیں پاتا جیسا کہ ہمارے جیسے ترقی پذیر معاشرے اور تیسری دنیا میں یہ المیہ زیادہ پایا جاتا ہے۔ ہر دو کان اور ہر چورا ہے سے فکر بننے لگتی ہے۔ وہ اسی معیار کی ہوتی ہے جس معیار کا کوئی صاحب علم ہوتا ہے۔ تفکر کی سطح زیادہ بلند نہیں ہو پاتی تو ہر تفکر و تدبیر کو ہر شخص اپنے زاویہ نگاہ سے غور و فکر کا میدان بنالیتا ہے۔ یہ صورتحال فکری اضحکال اور افراتفری کا موجب بنتی ہے جیسے ہم ایک فکری جنگل سے گزر رہے ہیں۔ برعظیم کامسلمان فی الواقع جذباتی ہے۔ ایک جگہ جب ٹھہر گئے تو بس وہی چج اور بلند ہے۔ صبر و استقامت اور غور و فکر دراصل وہ معیار ہے کہ آپ فکر بھی کریں اور تعین فکر بھی کریں۔ اس کے تو اتر و تسلسل کو ماضی میں تلاش کریں۔ اس کی قدر و قیمت کا اندازہ کریں۔ اس کے دور جدید میں قابل عمل ہونے کے طریق کا وضع کریں۔ اس کے انفرادی و اجتماعی پہلوؤں کی عملی پذیرائی کے اثرات کا جائزہ لیں اور اسے ایک ٹھوس حکمت عملی سے مربوط کریں۔

عقائد اور فکر کے امتیاز کو سمجھنے سے یہ مسئلہ حل ہو سکتا ہے لیکن عقائد سے فکر کے میدان میں داخل ہونے کے لیے جس ریاضت و مطالعہ علم و تفکر اور نظر بینا کی ضرورت ہوتی ہے وہ ضرورت معاشرے سے ہی پوری ہو سکتی ہے۔ ہم عقیدتوں کو محدود کر کے اس پڑھت جانے والے اور نظری ہیر و ازم پر یقین رکھنے والے معاشرے کا حصہ ہیں۔ یہی لوگ اکثریت میں ہیں۔ اس لیے معاشرے کا طاقتو رعنصر بھی یہی ہیں۔ یہی لوگ عقیدے کا مطلب نکالتے ہیں۔ اسی ہٹ دھری

اور طاقت کا نتیجہ ہمارا زوال اور عدم تحفظ کا چیلنج ہے۔ عقائد بنیادی طور پر انسان کی تعمیری تربیت کو پختہ کر کے معاشرے میں سلیقے سے رہ کر مقاصد معاشرہ اور انسان کو آگے بڑھانے کی ایک ارتقائی حکمت عملی سے وابستہ ہوتے ہیں۔ عقیدہ وہ پھول ہے جو کسی بھی قسم کے معاشرے میں پیدا ہو کر صرف اور صرف خوبصورت ہے۔ ہمارا یہ تصور بھی صحیح نہیں ہے کہ باقی دنیا بد عقیدہ ہو گئی ہے۔ ایسا نہیں ہے۔ عقیدہ ہر انسان و قوم کے آگے بڑھنے کی شرط ہے۔ مسلمان یہاں تک پہنچا ہے تو اس کے پیچے بھی عقیدے کی قوت رہی ہے۔ ہمیں سمجھ نہیں آ رہی تو یہ کہ ہم اب بھی کیسے اپنے ہی عقیدے پر آگے بڑھ سکتے ہیں؟

تازہ فکر کے بغیر تازہ قوت میسر نہیں آتی اور تازہ قوت کے بغیر زوال کو روکا جا سکتا ہے نہ آگے بڑھنے کا عمل دوبارہ شروع ہو سکتا ہے۔ تفکر سے تازہ قوت کے ساتھ جنم لے کر ایک نئے حرکتی نصب العین کی طرف بڑھنا وقت کی ضرورت ہے۔ مایوسیاں، جن کا تذکرہ پچھلی سطور میں ہوا ہے محض نصب العین کے شعور سے محروم ہونے کی بناء پر ہیں۔ نصب العین کا شعور تازہ فکر سے میرا سکتا ہے۔ اور تازہ فکر سے تازہ قوت مہیا ہو سکتی ہے۔

تازہ فکر کی زمین سماج ہوتا ہے۔ سماج انسانوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ سماج میں بننے والے انسانوں کی ضرورتیں اور حاجتیں بتدریج بدلتی آ رہی ہیں۔ پھر کے دور سے جدید ترقی یافتہ سماج تک کا سفر انسان کی ضرورتوں کے ارتقاء کا سفر ہے اور اپنی شناخت اور باقی رہنے اور آگے بڑھنے کے سفر کا نام ہے۔ انسان کا ابتدائی دور خوراک، کپڑے اور چھٹ کی آرزوؤں سے ہی لبریز تھا جبکہ شناخت کے پیمانے بھی انتہائی محدود داروں میں تھے۔ پھر جدید ترقی یافتہ دور میں انسان کے اندر اس سے آگے کی آرزوؤں نے جنم لیا اور اس نے جسمانی لحاظ سے میدان صحت میں، روحانی لحاظ سے بطور ذات، علمی لحاظ سے حصول شعور و آگاہی میں اور عملی لحاظ سے تجزیر کائنات اور تخلیقات میں نمایاں ترقی کر لی ہے مگر اس سب کے باوجود انسان عمرانی نقطہ نگاہ سے اور اپنی شناخت کے مقام و معیار میں پھر کے دور سے شاید چند ہی قدم آگے بڑھا ہے جس سے متعلق اس تحریر میں جا بجا تذکرہ ہے کہ عمرانی نقطہ نگاہ سے اکھڑ رہنے میں کوئی قابل عمل اور مثالی نمونہ سامنے نہیں آ رہا جیسے برعظیم پاک و ہند میں صدیوں سے ایک جگہ رہنے کے باوجود ہندو و مسلمان ایک ساتھ رہنے کے مسائل کا شکار ہیں۔ شناخت اور برتری کے وہی پرانے انسان کش اور قتل و غارت گری کے وہی طریقے اور پیمانے راجح چلے آ رہے ہیں۔ امریکہ، ہیر و شیما پر ایتم بم پھینک کر

شاختی طاقت پر فخر کرتا ہے۔ عراق اور افغانستان، فلسطین، کشمیر اور بوسنیا میں قتل عام اسی شناخت کا شاخانہ ہے اور لوگ جب مزاحمت پر اتر آئیں تو پھر وہ دہشت گرد ہوتے ہیں۔ پھر کے دور کا بھی تو پیمانہ یہی تھا۔ انسان دوستی کی بنیاد پر شناخت اور برتری کے پیمانے نہیں بن پائے تو اندازہ لگانا درست ہے کہ ابھی کرنے کا بہت سا کام باقی ہے۔

یہ جائزہ اس طرف توجہ مبذول کرانے کی کوشش ہے کہ یہ رزم گاہ حیات ہے۔ باقی رہنے اور آگے بڑھنے کی جستجو اور آرزو کا تعلق انسان سے ہے۔ انسان محض شعور کی بناء پر حیوان سے بلند تر ہے۔ شعور محض ارتقاء میں ہے۔ ہم جس موز یا وقت پر دنیا کی رزم گاہ سے گزر رہے ہیں۔ بلاشک و شبہ انسانی شعور و انسانی برتری بہت بلند ہوئی ہے مگر کمال کے درجے سے یہ ابھی تک بہت دور ہے۔ اس لیے ہم جہاں ہیں، جیسے ہیں اور ہمیں مٹا بھی پسند نہیں ہے تو پھر زندہ رہنے اور آگے بڑھنے کے لیے زمانے کے مجوزہ و مر وجہ طریق ہائے عمل اختیار کرنے ہوں گے۔ یہ رک جانے کا عمل، یہ ٹھہر جانے کی عادت، یہ زوال پر نوحہ گری، یہ شکست خورده تاثرات، یہ تقلید کی آسودگی، یہ تخلیق سے افرادگی باقی رہنے اور آگے بڑھنے کی تمنا کا اظہار نہیں ہیں۔ فیضِ احمد فیض نے یہ شعر کسی اور مناسبت سے لکھے تھے لیکن ان سے یہ بات ضرور جھلکتی ہے کہ کہانی یہاں بہر حال ختم نہیں ہوئی۔

یہ داغ داغ اجالا، یہ شب گزیدہ سحر
کہ انتظار تھا جس کا، یہ وہ سحر تو نہیں ہے
یہ وہ سحر تو نہیں کہ جس کی آرزو لے کر
چلے تھے یار کہ مل جائے گی کہیں نہ کہیں منزل
فلک کے دشت میں تاروں کی آخری منزل

۳۔ قوت

ایک متعین نصب العین کے حصول کیلئے مطلوب عناصر اربعہ میں تیراعضرقوت ہے۔ قوت کے ساتھ لفظ طاقت بھی استعمال ہوتا ہے۔ طاقت کے لفظ میں جارحیت کا وزن زیادہ محسوس ہوتا ہے اور قوت موجودگی کا احساس دلاتی ہے اور کسی کام کے ہونے یا نہ ہونے کی صلاحیت کا اظہار ہے۔ اس بات کو یوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ مسئلے کا ایک پہلو اپنی کمیونٹی، گروہ یا معاشرے کے اندر

اس بات کا شعور بیدار کرنا ہے کہ ان کی حیات و بقاء کو خطرہ ہے۔ یہ باور کرانے کے لیے کہ ان کی حیات و بقاء کو کہاں سے اور کیسے خطرہ ہے۔ دلائل اور ذرائع کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ ابتدائی قوت ہے۔ دوسرے لفظوں میں اپنی کمیونٹی، گروہ یا معاشرے پر اثر انداز ہونے کے لیے ایک قوت درکار ہوتی ہے۔ قوت جب معاشرے پر اثر انداز ہو کر چیلنج سے نمٹنے کی صلاحیت حاصل کر لیتی ہے تو ایسی قوت طاقت کے غضرے لے لبریز ہو جاتی ہے اور مزاحمت پر اتر آتی ہے۔

موجود معاشرے میں جاری و ساری زندگی بذات خود ایک قوت ہوتی ہے۔ معاشرتی ڈگر اور رجحان بدلا آسان کبھی نہیں رہا۔ اس کے لیے شعور چیلنج اور شعور فکر کو اجاگر کرنا انتہائی ضروری ہوتا ہے ورنہ مطلوبہ قوت حاصل نہیں ہو پاتی۔

ہمارا چیلنج برعظیم میں خصوصاً موجودہ بھارت میں مقیم مسلمانوں اور دوسری مذہبی اقلیتوں کو ”ہندو اتا“ نظریہ قومیت کے اثرات سے بچنے کے راستے تلاش کرنا ہیں۔ اس لحاظ سے فکر اقبال ہی وہ فکر ہے جو ”ہندو اتا“ کی فکری طاقت سے نبرد آزمائنا ہونے کی صلاحیت رکھتی ہے کیونکہ تاریخ کے ایک موڑ پر کامیاب مقابلہ کر چکی ہے۔

”ہندو اتا“ بھی ہندوؤں کے تاریخی ورثے کا تسلیم ہے۔ یہ فکر تازہ نہیں ہے۔ فکر ”ہندو اتا“ ہندوؤں کے ہاں ایک نصب العین کی حیثیت سے تاریخی روایت کے طور پر آگے بڑھی ہے۔ باقی رہنے اور آگے بڑھنے کی یہ بنیادی شرط ہے۔ یہ بات تب خطرناک ہو جاتی ہے جب آپ دوسروں کو مٹا کر آگے بڑھنا چاہتے ہوں۔ ”ہندو اتا“ کے تحت دوسروں کو مٹا کر آگے بڑھنے کا لائک عمل طے کیا گیا ہے تو اسکی مزاحمت ہو گی۔ بنیادی ہدف مسلمان ہیں۔ انہیں اگر مٹا منظور نہیں تو مٹکرانا مجبوری ہے۔ یہ مکرا وغیرا ایک تاریخی تسلیم کی حامل فکر، نتیجہ خیزی کے عمل سے گزری فکر اور تازہ امتنگوں اور امیدوں سے بھر پور فکر کے بغیر ممکن نہیں۔ مکرا و کے لیے جس قوت کی ضرورت ہوتی ہے اس کی بنیاد فکر پر ہوتی ہے۔ اس لیے ان سطور کے مصنف کا اصرار ہے کہ فکر اقبال میں ابھی وہ تازگی اور جان باقی ہے کہ تازہ چیلنج سے نمٹنے کے لیے اس فکر کی بنیاد پر سماجی قوت حاصل کی جاسکتی ہے۔ برعظیم کی تاریخ کے اس نئے موڑ پر ایک بار پھر فکر اقبال ہی واحد مزاحمتی فکر کے طور پر ابھر کر سامنے آ رہی ہے۔ تاریخی تسلیم کو شعوری انداز سے آگے بڑھنے کے لیے گذشتہ نصف صدی میں بدمقہ سے کوئی کام نہیں ہوا۔ اگر کسی اہل علم و فکر نے کوشش کی بھی ہے تو وہ کوشش اقبال کی سطح پر بھی پہنچ نہ پائی جبکہ علماء و صوفیاء کے ایک بڑے طبقے نے برعظیم کے وسیع تناظر میں کام کے بجائے محض

”پاکستان“ میں اسلامی نظام کے نفاذ کو نعروں کا روپ ضرور دیا جس کا نتیجہ بھی کوئی حوصلہ افزاء نہیں ہے اگر زیادہ واضح اور آج کے لفظوں میں کہا جائے کہ مسلمانان بر عظیم کے مستقبل کے حوالے سے سیاسی سمتوں پر اقبال کے بعد کام نہیں ہوا تو اس میں کوئی مبالغہ نہیں ہو گا۔

قوت کے حوالے سے اگلا سوال اس کے منبع و ذرائع ہیں۔ تاریخ کے اس مؤٹ پر اقبال کی فکر کا پہلا کامیاب نتیجہ ”پاکستان“ تازہ قوت کے حصول کا میدان ہے۔ کئی ایک خرابیوں کے باوجود ”پاکستان“ بر عظیم بلکہ عالم اسلام کے لیے تازہ قوت کا ایک غیر محسوس کردار ادا کر رہا ہے۔ یہ الگ بحث ہے کہ اس عمل میں ریاستی منشاء اور عوامی ولولہ میں کتنا تابہ ہے؟ یہ بحث بھی فی الحال ہمارے موضوع سے خارج ہے کہ ”تازہ قوت“ کا استعمال درست ہو رہا ہے یا نہیں؟ بات، جس کی طرف توجہ مبذول کرانا مقصود ہے وہ یہ ہے کہ ”پاکستان“ کے سماج کے اندر وہ تذپب، وہ جنون، وہ آرزو جو مقصد کی لگن سے پیدا ہوتی ہے، پوری طرح زندہ ہے۔ بلند مقصد کے لیے جس قوت کا حصول ضروری ہوتا ہے وہ ”پاکستان“ کے سماج میں پوری طرح موجود ہے اور یہی بات باقی رہنے اور آگے بڑھنے کی مناسبت سے حوصلہ افزاء ہے۔ ریاستی قوت اپنی جگہ اہمیت رکھتی ہے لیکن دور رس تبدیلیاں عوامی توجہ و دلچسپی سے جنم لیتی ہیں۔

گویا ”قوت“ کا حصول لازمی شرط ہے جس کے حصول کے حوصلہ افزاء آثار پاکستانی معاشرت میں موجود ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ان آثار کو تازہ چیلنج سے مسلک کر کے پہلے مرحلے پر پاکستان کی معاشرت میں قوت پیدا کی جائے جبکہ دوسرے مرحلے پر بھارت کے اندر مسلمانوں اور دوسری مذہبی اقلیتوں شود را اور دوسرے درجے کے ہندوگروہوں کو ”ہندو اتا“ کی مزاحمت کے لیے منظم کرنے کی حوصلہ افزائی کی جائے۔ یہ بھارت میں محض انتشار و افتراء تفری کی غرض سے نہیں ہونی چاہیے۔ کیونکہ اس کا نقصان لا محالہ کمزور لوگوں کا ہوتا ہے اور یہ بات ریاست کے حق میں رہتی ہے۔ قوت کے لیے بھارت کے اندر حوصلہ افزائی سے مراد ہندوؤں کی اکثریت کو باور کرانا کہ دوسروں کو مٹانے کے جذبے جس سماجی انتشار کو جنم لیتے ہیں اور جو نقصان پہنچاتے ہیں وہ مٹ جانے والوں کی نسبت باقی رہنے والوں کے لیے زیادہ تکلیف دہ ہوتے ہیں۔ مسلمانوں اور دوسری مذہبی اقلیتوں نیز کم درجہ ہندوؤں کو یہ باور کرانا کہ باقی رہنے کے لیے قوت درکار ہوتی ہے۔ قوت کی موجودگی میں جاریت کے جذبے ماند پڑ جاتے ہیں۔ اس لیے جاریت کو روکنے کی تیاری کے لیے قوت کی ضرورت ناگزیر ہے۔ باقی رہنے اور آگے بڑھنے کیلئے قوت کا حصول انسانی حق و ضرورت ہے۔ اسے

دوسروں کے مٹانے کے لیے استعمال میں لانا جا رہی ہے بلکہ غیر انسانی سوچوں کا غماز ہے۔

۳۔ تازہ حکمت عملی

بر عظیم پاک و ہند کے اجتماعی فکری تناظر میں تازہ حکمت عملی درکار ہے جو اس بات کے تجزیے سے وابستہ ہے کہ کیا مسلمانوں کو ان کے عظیم ماضی یعنی ہندوستان سے الگ ہو کر ہندوستان کی تقسیم انتظامی کو ناگزیر قرار دے کر اور مسلمانوں کو اس کے عظیم ہندوستان سے ہٹ کر ایک کونے میں مختصر سے علاقے میں ایک آزاد یونٹ پاکستان کا قیام ہی آخری منتها مقصود تھا؟ اس سوال کے تجزیے اور تاریخی فکر کی روشنی میں اس کے جواب سے جدوجہد کشمیر اور پورے بر عظیم کے مسلمانوں کے تحفظ و بقاء کے تازہ چیلنج سے نہنے کا گہرا تعلق ہے۔ شامی علاقوں میں سمٹ جانے کا تصور دراصل ہندوستان میں سیاسی تبدیلی کے نتیجے میں مسلمانوں کے تحفظ کو لاحق خطرات سے نکلنے کے لیے واحد امکانی راستے کے طور پر تھا۔ پورے ہندوستان کو چھوڑ کر صرف شامی علاقوں میں ایک مختصر سے علاقے میں ہمیشہ کے لیے سمٹ کر بیٹھ جانا تصور پاکستان نہ تھا۔ بلکہ علامہ محمد اقبال کی فکر کی بنیادی روح یہ تھی کہ مسلمان ہوئے سیاسی حالات میں ایک اقلیت میں تبدیل رہے ہیں جو آنے والے جمہوری فلسفے میں اپنی تہذیب و تمدن سے ہاتھ دھو بیٹھیں گے اور بالآخر مٹ جائیں گے۔ اس لیے فوری حکمت عملی کے طور پر شامی علاقوں میں سمٹ کرنے سے سرے سے اپنی بقاء اور عروج کے لیے صفت بندی کا تصور دیا۔ گذشتہ ۵۸ سالوں میں پاکستان اپنی بقاء کے کئی نازک لمحوں میں سرخونکلا ہے۔ بنگلہ دیش کا واقعہ تصور پاکستان کو نقصان نہیں پہنچاتا بلکہ اقبال جس قومی شعور کی بات کرتا ہے، یہ تصور پاکستان کا اگلہ مرحلہ ہے۔ غالباً بنگلہ دیش کے قیام اور اس کی تلویحوں کا ہم نے احتیاط سے تجزیہ نہیں کیا بلکہ یہ کہوں گا کہ اس سارے تلخ عمل کو ہم نے ہندوستان میں جاری مسلم تاریخی ورثے کے بطن سے ابھرنے والی فکری زنجیر کے تناظر میں دیکھنے کے بجائے اسے وقت مفادات کے تناظر میں دیکھا ہے۔ ہندوستان میں آزاد یونٹ مزید بینیں گے۔ یہ تاریخ کا عمل ہے۔ کشمیری مسلمانوں کے علاوہ سکھوں کی بھی ایک جدوجہد زور و شور سے جاری ہے۔ یہ جدوجہد بالآخر کامیاب ہو گی جبکہ باقی کئی ریاستیں بھی آزاد ہوں گی۔ دراصل اقبال نے اپنی فکر میں آئندہ کے آزاد یونٹوں کی بھرپور نشاندہی کی تھی۔ یہ آزاد یونٹ اپنے وقت کے دھاروں کے مطابق آپس

میں تعلق کو آئینی اور قانونی صورت دے لیں گے۔ یہی تصور جدوجہد پر آمادہ کرتا ہے اور تصور اقبالستان کو تقویت پہنچاتا ہے۔

اس ضمن میں ہماری حکمت عملی واضح ہونی چاہئے۔ مزید آزاد ریاستوں کا ہندوستان کے اندر قیام عوامی شعور کی مزید ترقی کا باعث ہوگا۔ بنیادی بات انسان کی بہتر افزائش اور بہبود ہے۔ عوامی شعور کی جتنی سطح تیزی سے بلند ہو رہی ہے، سیاسی و معاشی حق اور ضرورتوں کی سطح اور درجے بھی تبدیل ہو رہے ہیں۔ استحصال کے خلاف بیسویں صدی ایک جدوجہد کی صدی شمار ہوتی ہے۔ استحصال مذہب کی بنیاد پر ہو رہا ہو یا علاقہ، زبان، نسل اور رنگ کی بنیاد پر، دن بدن عوامی سمجھ میں آ رہا ہے۔ بنیادی مقصد انسان کو خوف غم سے پاک افزائش اور بہبود کا ماحول و معاشرہ فراہم کرنا ہے۔

چیلنج کے ابھرنے اور اس کا شعور حاصل ہو جانے کے بعد ایک تاریخی تسلیل و تواتر کے حاصل فکر کا تعین اور اس کی بنیاد پر سماجی قوت کا حصول لازمی عناصر کے طور پر ایک حکمت عملی کا تقاضا کرتے ہیں۔ حکمت عملی کے دو حصے ہوتے ہیں۔ ”ایک جو عوامی ہوتا ہے جسے عوام کے شعور کا حصہ بنایا جاتا ہے اور تمام ممکنہ ذرائع استعمال میں لائے جاتے ہیں،“ جبکہ دوسرے حصے کا تعلق کسی منظم گروہ کی اندر وہن خانہ حصول مقاصد کے لیے ممکنہ ذرائع و طریق کار کے تعین سے ہوتا ہے۔ حکمت عملی کی بنیاد جس قدر انسانیت نواز ہو گی اتنی کامیاب ہو گی۔ اسلام کی خوبصورتی، ہی یہ ہے کہ وہ خفیہ مقاصد اور حکمت عملی پر زور دیتا ہے نہ یقین رکھتا ہے۔ مسلمان دنیا کی واحد سادہ قوم ہے جو اپنے مقاصد اور حکمت عملی خفیہ نہیں رکھتے۔ کیونکہ اسلام کا منشاء انسانوں کو مسائل میں پھسانا نہیں بلکہ حل کرنا ہوتا ہے۔ اس کی بنیاد انسان اور کائنات اور تعلق باللہ ہوتی ہے۔ یہ علی الاعلان ہے۔ اس لیے بھارت کی سطح پر ایک ارب سے اوپر انسانوں کو ذات کا شعور بذریعہ ایک خدا کے عقیدے کے ساتھ دینا انسانیت کی خدمت کے مترادف ہے۔ یہ پہلے بھی ہوا ہے اور مسلمان اس کا نتیجہ ہیں مگر ایک خاص موقع پر مقاصد انسانی کا عقیدہ قدرے کمزور ہوا تو دوسرے مقاصد از قسم علاقائی، مذہبی، سیاسی، نسلی یا معاشی و سیاسی کے اسلامی حرکت کو کمزور کر دیا اور بالآخر ایک خدا کے عقیدے کی تحریک کے گئی اور انسان دوسری عصیتیوں میں کھو کر رہ گیا۔ اب ہم مسلمان ہیں، ہندو ہیں، عیسائی و بدھ اور سکھ اور دوسرے ہیں مگر ”انسان“ کتنے ہیں یہ سوالیہ نشان ہے؟

اسلام جب ہمیں صرف یہ سکھاتا ہے کہ آپ صرف انسانوں کو ایک خدا کی پہچان کرائیں، ایک خدا ہر مذہب کے اندر موجود ہے لیکن ابتدائے زمانہ سے بعض مذاہب میں یہ تصور قدرے

دھندا کر پیش کیا جاتا رہا۔ اسلام، مذہب کا آخری ایڈیشن ہونے کی بناء پر زیادہ واضح صورت میں ایک تصور خدا پر زور دیتا ہے۔ بھارت کے منظر پر ”اقبالستان“ کے مقاصد قطعاً شمنانہ نہیں ہیں کیونکہ ان مقاصد میں انسان کو دوسرے انسانوں کی گردن پر سوار ہو کر اتحصالی رویے کو ختم کرنا ہے۔ سیاسی و سماجی، معاشی و تہذیبی طور پر ایک دوسرے پر غلبے کے تصور کو ختم کرنا ہے۔ بھارت کے اندر مزید خود مختار ریاستیں ہی انسان کو انسان کی گردن پر سوار ہونے اور اتحصال سے محفوظ رکھ سکتی ہیں۔ ہمارا خیالوں اور خوابوں میں رہنا بے عملی کی نشانی تو ہو سکتی ہے، حقائق کی نہیں۔ من موہن سنگھ بھارت کے وزیر اعظم بننے تو انہوں نے ہی سکھوں کے قتل عام کی معافی مانگی۔ یہ BJP اور کسی ہندو نمائندہ کو توفیق نہ ہوئی۔ کل گجرات کے مسلمانوں کے قتل عام کی معافی بھی مانگی جائے گی مگر سکھوں اور مسلمانوں کے قتل عام سے جو اقلیتوں کو پیغام دینا مقصود تھا، وہ تو دیا جا چکا ہے۔

”اقبالستان“ ایک حکمت عملی کے طور پر بھارت کے وسیع خطے میں مزید آزاد ریاستوں کی تشكیل کا نام ہے جو اپنے معاشی وسائل خود پیدا کریں اور ان وسائل کو اپنی حدود میں اور اپنے سیاسی اقتدار کے تحت وہاں بننے والے خط غربت سے بچنے والے انسانوں پر صرف کریں۔ دوسرے لفظوں میں عمرانی نقطہ نگاہ سے جس کسی عصیت کی بناء پر انسان اکٹھے رہنے پر عار محسوس نہیں کرتے تھے انہیں بطور انسان موقع ملنا چاہیے کہ وہ انسانی زندگی کو معاشی و سیاسی لحاظ سے بہتر بنائیں۔ اس سے ہندوستان یا بھارت کو نقصان نہیں ہو گا۔ انسانوں کا آپس میں دست و گریاں رہنا نقصان پہنچا سکتا ہے جیسے ایک دور میں انگریز نے اس کا فائدہ اٹھایا۔

بھارت میں آبادی مذہبی لحاظ سے بھی تقسیم ضرور ہے لیکن مذہب کو اتحصال کیلئے استعمال میں لائے جانے کا سلسلہ تاریخی ہے۔ یورپ نے مذہبی اتحصال کے خلاف بغاوت کی اور ترقی کی۔ روس اور اس کے علاقے نے بغاوت کی اور دنیا کی دوسری بڑی طاقت کی منزل تک پہنچ گیا۔ یہ غلط فہمی ہے کہ مذہب کو ان قوموں نے چھوڑ دیا تھا۔ مذہب کو نہیں چھوڑا تھا۔ مذہبی اتحصالی طبقے کو چھوڑا تھا۔ بھارت میں ایک چوتھائی آبادی ایسی ہے جو محض اور محض اکیسویں صدی میں ذات پات کی تقسیم کے تحت مگر پوری مذہبی تائید سے مسلسل اتحصال کا شکار ہے۔ اس طرح کی مثال دنیا میں کہیں نہیں ملتی۔ ”اقبالستان“ فکر کے تحت ہم زور دیں گے کہ مذہبی عقیدے کو چھیڑے بغیر چھوٹی ذات کے ہندو کہلانے والوں کو ان کے انسانی حقوق حاصل ہوں۔ ان کی الگ ریاستیں قائم ہوں، مذہبی عقیدے اپنی جگہ رہیں۔ انسانی عقیدے کو پروان چڑھانے کی ضرورت ہے۔ جبکہ

قریب قریب ایک چوٹھائی آبادی مسلم اقلیت ہے جنہیں خوف و غم اور اتحصال سے محفوظ رکھنے کے لیے ”اقبالستان“ کے تصور کو عملی شکل دینے کی ضرورت ہے جبکہ ایک اچھی خاصی تعداد عیسائیوں، بدھوں سکھوں کی بھارت میں موجود ہے جو بہر حال مٹنے پر آمادہ نہیں ہیں۔ انہیں بھی مناسب بندوبست کی ضرورت ہے۔

حوالہ

- ۱۔ اردو جامع انسائیکلو پیڈیا، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، ص ۵۲۶
- ۲۔ روزنامہ جنگ، لندن، ۸ فروری ۱۹۹۹ء
- ۳۔ ہندوستان میں تاریخ کا قتل، صبغ پبلشرز، لاہور، ۲۰۰۳ء
- ۴۔ تفصیل کے لیے میری تحریر ”تحفظ و احیاء اسلام کے لیے نیست اور حکمت عملی“، ملاحظہ کی جاسکتی ہے

شرائط فکر و تعین فکر

برعظیم پاک و ہند میں مسلمانوں کو اپنے تحفظ کا چیلنج درپیش ہے۔ اپنی حیات، آباد و اور اقدار کے لیے فکرمند ہونا فطری ہے۔ فکرمند ہونا ضروری ہے مگر اس سے بھی زیادہ ضروری یہ جانتا ہے کہ ہم تاریخی فر کے جس موز پر ہیں، اس کی آواز و پکار کیا ہے؟ نصب العین کا تعین ایک مشکل مرحلہ ہی مگر کسی سفر سے پہلے اس کا اندازہ ہونا لازمی ہے۔ تازہ فکروہ ہوتی ہے جو ٹھہرا دیا مایوسی کے کسی موز پر قوم میں زندگی کی تازہ لہر برپا کر کے تازہ دم کر دے۔ اس لیے برعظیم کے مسلمانوں کے لیے یہ ایک نازک وقت ہے۔ انہیں اپنے سفر، اپنے نصب العین اور اپنی فکر کو تازہ حالات اور تازہ چیلنج کی روشنی میں از سرِ نو متعین کرنا ہے۔ ایسے موقع پر ضروری ہے کہ تازہ فکر کی جستجو اور تعین سے پہلے ان شرائط فکر کا مطالعہ کریں اور پھر اس کی روشنی میں پرکھ کر اسے اختیار کریں۔ شرائط فکر کے تحت چند اہم نکات کا بیان دراصل تازہ فکر کو ایک کسوٹی اور معیار پر پرکھنا ہے۔

شرائط فکر:

ایسی تازہ فکر جو ذیل کے معیارات پر پوری اترتی ہو، ان کو یوں بیان کیا جاسکتا ہے۔

تازہ فکر:- جو ہمارے مذہبی عقائد و افکار کی آئینہ دار ہو۔

تازہ فکر:- جس کے اندر حرکت اور نموکی صلاحیت ہو۔

تازہ فکر:- جو نصب العینی خصوصیات کی حامل ہو۔

تازہ فکر:- جو ولولہ انگلیز، یقین افزودا اور انقلاب پرور ہو۔

تازہ فکر:- جو ہماری زندگی، ہماری آبڑ و اور ہماری آزادی کی محافظہ اور نقیب ہو۔

تازہ فکر:- ماضی اور حال کی حقیقوں اور مستقبل کی آرزوؤں کی آئینہ دار ہو۔

- تازہ فکر:- جو عملیت پسندی اور نتیجہ خیزی کی ضمانت مہیا کرنے والی ہو۔
- تازہ فکر:- جو مسلم تاریخی ورثے کا تسلیل و تواتر ہو۔
- تازہ فکر:- جو ”پاکستان“ کا تسلیل و تواتر ہو۔
- تازہ فکر:- جو باقی رہنے اور آگے بڑھنے کی ضمانت ہو۔
- تازہ فکر:- جو مستقبل کے تقاضوں کی نشاندہی کرتی ہو۔

شرائط فکر کی وضاحت کے بعد تصور اقبالستان کو ان شرائط کی کسوٹی پر جانچنا ہے لیکن اس سے قبل ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ”پاکستان“ کا شرائط فکر کے تحت جائزہ لیا جائے جس کا آغاز ہم کہہ سکتے ہیں کہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد ہوتا ہے۔ ۱۹۰۶ء میں اسے ایک سیاسی جدوجہد کے فورم پر لایا گیا۔ ۱۹۳۰ء میں خطبه اللہ آباد میں اس کی فکری جہت کا رخ معین کیا گیا۔ ۱۹۳۰ء میں اس کی عملی ہیئت کا تعین کیا گیا اور ۱۹۴۷ء میں یہ عملی لحاظ سے وجود میں آگیا۔ اس کی فکری لڑیوں میں نمایاں ترین سر سید احمد خان اور پھر فیصلہ کن نصب العین کا تعین اور حال مستقبل کے خدو خال علامہ محمد اقبال کے ہاتھوں تشكیل پائے اور عملی جدوجہد کی رہنمائی فیصلہ کن دور میں قائد اعظم محمد علی جناح کے حصے میں آئی۔

اقبال ہی کی فکر ”پاکستان“ کی فکری، نظریاتی، عملی اور نتیجہ خیزی کا باعث تھی اور تصور اقبالستان کا محرك بھی فکر اقبال ہی ہے۔ اس لیے ”پاکستان“ کے حوالے سے تحریک، تکمیل اور تاریخ کو مذکورہ شرائط پر پر کھنے سے ”تصور اقبالستان“ کے جواز پر غور و فکر میں آسانی ہو جائے گی۔ ۱۸۵۷ء کے واقعہ پر قبل از یہ صفحات میں کئی جہتوں سے بات ہو چکی ہے۔ جدید مسلم جدوجہد، کامیابی و ناکامی کے حوالے سے جب بات ہوگی، ۱۸۵۷ء کے فیصلہ کن واقعات کا ذکر ضرور آئے گا۔ پاکستان کی فکر کے ڈائٹے تو ہمارے بعض لکھنے والے ہندوستان میں داخل ہونے والے پہلے مسلمان سے شروع کرتے ہیں۔ ممکن ہے کہی خاص جہت سے دیکھیں تو آپ ایسے بھی ڈائٹے ملا سکیں لیکن تاریخ کے واقعات ۱۸۵۷ء کے رد عمل میں ایک خاص رخ اختیار کرتے ہیں جو پہلے نہ تھے۔ پاکستان کی تحریک کی بنیاد ہی دو قومی نظریے سے اٹھی۔ ہندو مذہب کے پیروکار اکثریت میں سامنے آئے اور مسلمان اقلیت میں۔ جبکہ نیا جمہوری نعروہ اکثریت کی امیدوں اور اقلیت کے خوف کے درمیان نئی فکر و تہذیب کا باعث بنا۔ مسلمانوں نے نئے جمہوری فلسفے اور اکثریت مذہب ہندو مت کی تاریخ اور ۱۸۵۷ء کے بعد ان کے تیور سے یہ اندازہ لگانے میں دیر

نہیں کی کہ مسلمان تاریخ کے ایک نازک موز اور مخالفانہ ہواں کے دو شپر ہیں۔ باقی رہنے اور آگے بڑھنے کیلئے ایک چیلنج پوری طرح سامنے آ چکا تھا۔ اس لیے مسلمانوں نے پہلے سر سید احمد خان کی اصلاحی و تعلیمی کاوشوں، پھر علامہ اقبال کی فکری اور نصب العینی سمتوں اور آخر پر محمد علی جناح کی پُر حکمت جدوجہد سے ”پاکستان“ کو واضح طور پر مدد ہبی عقاًدا اور افکار کا نتیجہ قرار دیا۔

پاکستان کے اندر حرکت اور نہموں کی مکمل صلاحیت موجود ہے۔ یہ اور بات ہے کہ مسلمان ”پاکستان“ کو امیدوں کی آخری اور فیصلہ کن کامیابی سمجھ کر جہاں تھے، جامد ہو کر رہ گئے۔ تصور اقبال دراصل ”پاکستان“ کی صلاحیت حرکت اور نہموں کا نتیجہ ہی تو ہے۔ اس پر الگ سے بحث بھی موجود ہے۔

پاکستان کے قیام کو ممکن بنانے میں اس کی نصب العینی قوت کا فیصلہ کن کردار ہے۔ ”پاکستان“ کی نصب العینی حیثیت و قوت اتنی جاندار تھی کہ ”پاکستان“ ولوہ انگلیزی، یقین افروزی اور انقلاب پروری کا نشان بن گیا۔ زندگی نے قربان ہونے سے در لغ نہ کیا۔ ایمان نے یقین کی منزلوں کو چھولیا اور ”پاکستان“ انقلاب کا پیش خیمه بن گیا۔

تصور پاکستان نے حیات کی حفاظت، آبرُو کا احترام اور آزادی کے امکان کو مسلمانوں کے اندر شعوری لحاظ سے بلند کیا۔ ذات کا شعور اور معاملات کا احساس بذات خود ایک بڑا کام ہے۔ قیام پاکستان کے وقت اور بعد میں ان تصورات کی عملی شکل کی صورت کیا رہی۔ یہ الگ بحث ہے جو آگے آئے گی۔ البتہ یہ حقیقت ہے کہ تصور پاکستان نے مسلمانوں کو شعور ذات دیا ہے۔ بلاشبہ ”پاکستان“ ماضی کی فکری زنجیر کی لڑی و کڑی ہے۔ حال کی حقیقت تھی اور ہے اور ہندوستان کے بعد مسلمانوں کی امید ہے اور امید رہے گی۔ شعور ماضی، شعور حال اور شعور مستقبل اس وقت عملی شکل میں برعظیم کے مسلمانوں کے سامنے ”پاکستان“ ہی ہے۔ عملیت پسندی اور نتیجہ خیزی وقت اور فاصلے سے مشروط ہے۔ ”پاکستان“ اس کی ضمانت کے طور پر ابھر اور اسی ضمانت کو ممکن بنانے کا ایک ست رفتار ہی سبھی، سفر جاری ہے۔

یہ تھیں آرزو میں، حسرت میں اور تمباک میں جو قیام پاکستان کے پس منظر میں زیر بحث لائی گئی ہیں۔ پاکستان کا قیام عمل میں آیا اور اس کی عمر عزیز نصف صدی سے اوپر ہو گئی۔ بلاشبہ نتائج وہ سامنے نہیں آ سکے جس کی ضمیر مسلم نے آرزو کی تھی، جدوجہد کی تھی اور قربانی دی تھی۔ پاکستان کے ۵۸ سالہ سفر زندگی سے فخر کی کوئی بات نہ بھی دیکھی جاسکے مگر ما یوی کی ضرورت بھی نہیں۔ تصور پاکستان کی جدوجہد اور شعور ذات کی نسبت کے حوالے سے ایک سفر ہے جو جاری ہے۔ سفر جو

جاری رہتا ہے، بالآخر منزل پر اختتام پذیر ہوتا ہے۔ قوموں کے سفر نشیب و فراز سے گذر کر، ہی کامیاب ہوتے ہیں۔ اس لیے یہ کہنا بے جانہ ہو گا کہ ”پاکستان“، شرائط فکر پر پورا اترتا ہے۔

”پاکستان“ کی تشكیل اور تکمیل سفر ایک حرکت سے عبارت ہیں اس لیے ہم کہہ سکتے ہیں کہ

پاکستان: ہمارے مذہبی عقائد اور افکار کا حاصل ہے۔

پاکستان: کے اندر نصب الینی خصوصیات پوری طرح موجود ہیں۔

پاکستان: کے اندر حرکت اور نمو کی صلاحیت موجود ہے۔

پاکستان: ولولہ انگیز، یقین افروزا اور انقلاب پرور صفت سے محروم نہیں ہوا ہے۔

پاکستان: برعظیم کے مسلمانوں کی زندگی، آبرو اور آزادی کا محافظ اور نقیب ہے۔

پاکستان: برعظیم کے مسلمانوں کے ماضی و حال کی حقیقتوں اور مستقبل کی آرزوؤں کا آئینہ دار ہے۔

پاکستان: عملیت پسندی اور نتیجہ خیزی کی ضمانت مہیا کرتا ہے۔

پاکستان: مسلم تاریخی ورثے کی نتیجہ خیز کڑی ہے۔

پاکستان: مسلم تاریخی ورثے کا تسلسل اور تو اتر ہے۔

پاکستان: برعظیم کے مسلمانوں کے باقی رہنے اور آگے بڑھنے کی ضمانت ہے۔

پاکستان: کے حصول میں کار فرما فکر تازہ و م اور جاندار تھی۔

پاکستان: فکر مستقبل کی عملی بنیاد ہے۔

پاکستان کے حوالے سے نصف صدی بعد محض بعض ریاستی اقدامات کی بدولت حالات سے

طمینان نہ ہونا ایک الگ اور طویل بحث ہے۔ یہاں ”پاکستان“ کے تصور اور پاکستان کے عملی وجود کی

ضرورت و اہمیت کو برعظیم کے مسلمانوں کی حیات و بقاء کے تناظر میں بیان کرنا مقصود ہے۔ قیام

پاکستان سے پہلے کے منظر اور نصف صدی بعد کے پیش منظر کی روشنی میں اس کے مقام و اہمیت کو سمجھنا

ہے۔ ہر زاویہ نگاہ سے دیکھنا نصب الین کے حصول کی شرط ہے جن شرائط کو معیار قرار دیا گیا ہے۔

پاکستان ان پر پورا اترتا ہے۔ یہی بات ”تصور اقبالستان“ کے عملی شکل میں آنے کی امید دلاتی ہے۔

زندگی جذبوں، آرزوؤں، تمناؤں اور غور و فکر، تدبیر، عمل اور بالآخر سب کا ثابت نتیجہ

دیکھنے کا ایک عمل ہے۔ بچپن، جوانی اور بڑھا پا زندگی کے درجات ہیں۔ کمال یہ ہے کہ انسان اپنی

زندگی کے ہر ارتقائی رتبے یا درجے پر نہیں ان تقاضوں کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے اُس وقت کے

مطلوب نصب الین کے لیے اپنے حصے کا کام کرے۔ اقبال کا خاصا یہ ہے کہ انہوں نے اردو گرد کو

نظر انداز نہیں کیا۔ ۱۸۵۷ء کے واقعات اور انگریزوں کے برتاؤ کی روشنی میں عزم اور ارادوں نے سفر باندھ لیا۔ پھر سفر کے ہر نئے موڑ پر، ہر نئے پڑا و پروقت کے تقاضوں کو نہیں بھولے۔

۱۹۰۵ء تک ہندوستان کے مجموعی تناظر میں انگریزوں سے آزادی کے لیے ”ترانہ ہندی“، ”ہندوستانی بچوں کا قومی گیت“ اور ”نیا شوالہ“ ایسی نظمیں ہیں جو جوش و عزم کے ساتھ آزادی اور اپنے وطن کے خود مالک بننے کی فکر پر مشتمل ہیں۔ آگے چل کر ہندوستان کی داخلی صورت حال نے نئے امکان جنم دینے شروع کر دیئے۔ کانگریس کی سیاسی تحریک کے پس پردہ عزم کی نوعیت قدرے کھلنے لگی اور ۱۹۰۶ء میں مسلمانوں کو ”مسلم لیگ“ کے قیام کا فیصلہ کرنا پڑا تو اقبال نے ہندوستان کی آزادی پر تو مسلسل زور رکھا مگر جغرافیائی حقائق کی بناء پر اس آزادی کو دو قوموں کی مکمل آزادی سے مشرود کیا اور باور کرایا کہ ہندوستان کی آزادی کا مطلب یہ ہرگز قبول نہیں کہ ہندو آزاد ہوں اور باقی تمام مذہبی اکائیاں اقلیت ہونے کی بناء پر اکثریت کے تسلط میں چلی جائیں۔ چنانچہ اقبال نے زمینی حقائق اور سماجی ضرورتوں کی اہمیت کو مرکز بناتے ہوئے نئے لائحے عمل کی نشاندہی کی۔ یہ فکر پاکستان تھی۔ فکر پاکستان نفرت کی بنیاد پر قائم نہیں کی گئی مگر اس کو روکنے اور ناکام بنانے کا مزاحمتی عمل کانگریس اور ہندوؤں کی طرف سے نفرت انگیز بننے لگا جس کا نتیجہ بالآخر ہزاروں انسانوں کے قتل عام کی صورت میں نکلا۔

اقبال کے لیے یہ صورت حال گوتکلیف دہ تھی مگر اقبال نے اس کا جواب بصیرت و تدبر کی بلندیاں چھونے سے پہلے بھی اور بعد میں بھی انسان، آزادی اور خودی کا دیا۔ پیغام محبت کو بنیاد بنائے رکھا۔ نفرت اقبال کے پیغام میں نہیں مل سکتی۔ پھر جب اقبال محدود سے لامحدود کے سفر پر نکلتا ہے تو وہ انسان کی معراج ڈھونڈتا ہے۔ ہندو اور مسلم کی کوئی قید اس سطح پر وار نہیں ہوتی۔

نہ میں عجمی ، نہ ہندی ، نہ عربی وجازی

کہ خودی سے میں نے سکھی دو جہاں سے بے نیازی

(ضرب کلیم)

درویش خدا مست نہ شرقی نہ ہے غربی

گھر میرا نہ دلی نہ صفائیاں نہ سرقند

(بال جبریل)

اقبال پھر انسانیت کا پیغام بر بن جاتا ہے۔ اس درجہ بصیرت پر پہنچنے والا دنیا کا ہر بڑا آدمی چھوٹے سماجی مسائل سے لے کر کائنات اور انسان کی تخلیق کے راز پر غور و فکر کرتا ہے۔ یہی اقبال نے کیا۔ اقبال نے بھی عظیم مفکروں و فلاسفوں کی طرح اپنی ساری فلاسفی کی بنیاد ”خودی“ کے مرکز پر استوار کی اور ”خودی“ کی یہ ساری کہانی آنحضرت ﷺ سے وفاداری و محبت اور قرآن کے گرد گھومتی ہے۔ اقبال کا یہی کمال ہے کہ اس نے انتہائی بلند یوں پر پہنچ کر بھی مذہبی عقائد کی اہمیت کو نظرنوں سے او جھل نہیں ہونے دیا۔ قرآن نے انسان کو آگے بڑھنے کے لیے جس حرکت کی نشاندہی کی، جس نموکواجا گر کیا، جس نصب العین کو متعین کیا، اسے اپنی بصیرت سے اپنے اشعار میں نمایاں کیا، اپنی نثر میں سمو یا اور یوں اقبال قرآن کا ایک ایسا مفسر بن گیا کہ جس کی تفسیر و تعبیر آج انسانوں کے لیے ایک سنگ میل ہے۔ مسلمانوں کو بھی آگے دیکھنے کے لیے اقبال کی تفسیر قرآن کی طرف دیکھنا پڑتا ہے اور جو مسلمان نہیں ہیں مگر اہل فکر ہیں اور انہیں اسلام کو کسی حوالے سے جانتا ہے تو وہ بھی اقبال کی طرف رجوع کرتے ہیں۔

اقبال کی فکر قرآنی فکر ہے۔ اس کے شعر الہامی احساس لیے ہوئے ہیں۔ اس کی نشر فکری والہامی بلند یوں کا نمونہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال کی فکر تازہ ولولوں کو جنم دیتی ہے۔ یقین محاکم اور انقلاب انگیز عزم اُم اور ارادوں کو جوان کرتی ہے۔ اقبال کی فکر صرف افکار تک ساتھ نہیں دیتی۔ یہ تازہ ولولوں، تازہ یقین اور تازہ عزم انقلاب کے ذریعے میدان عمل میں کوئی پر تیار کرتی ہے۔ میدان عمل میں چھوڑ کر فکر اقبال ست نہیں ہوتی اور چست ہو جاتی ہے۔ یہ ولولہ انگیزیاں، یہ یقین افروزیاں، یہ انقلاب پرور ریاں تب تک تازہ وجہ رہتی ہیں جب تک نتیجہ سامنے نہ آ جائے، اقبال کی فکر کی یہ طاقت ہے کہ وہ نتیجہ خیزی تک ساتھ دیتی ہے۔ نتیجہ خیزی کی وضاحت بھی مناسب معلوم ہوتی ہے کہ جو ہماری زندگی، ہماری آبرو اور ہماری آزادی کی حفاظت کا بطریق احسن بندوبست کر سکے۔ بالفاظ قرآن ”لَا خوف عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ“۔ (اور ان پرنہ کوئی خوف اور نہ غم ہوگا)۔

یاد رہے قرآن کا مطلوب معاشرہ جس نصب العین کو متاع حیات بناتا ہے اس کا مرکز انسان کو خوف و غم سے نجات دلانا ہے۔ غم گز شتہ زندگی کا نہ ہو اور خوف آنے والی زندگی میں نہ آئے۔ زندگی دنیا کی ہو یا آخرت کی۔ خوف و غم سے پاک ہو۔ یہ وہ انسانی دستور و منشور ہے جسے قرآن نے بیان کیا، جسے آنحضرت ﷺ نے بطریق عمل پہنچایا جو رو بہ عمل ہے۔ محض ارتقاء میں ہے۔ اقبال نے اسی کو اپنے وقت کی دو پھر میں بیٹھ کر بیان کیا ہے۔ اقبال نے روایت کو مضبوطی

سے پکڑا۔ روایت کی کسی لڑی کو نظر انداز نہیں کیا۔ پہلے انسانوں نے قرآن کے حوالے سے یا قرآن کو مانے بغیر کچھ کہایا کیا۔ اقبال اسے نظر انداز نہیں کرتا۔ اسے بیک جنبش قلم مسترد بھی نہیں کرتا۔ وہ کیمیا گر کی طرح اپنے انسانوں کی بصیرت کو بغور دیکھتا ہے، اسے احترام کے دائروں میں لاتا ہے۔ پھر وہ وقت کی دوپہر میں بیٹھتا ہے۔ دھوپ و چھاؤں اور صاف وابراً لود آسمان کو دیکھتا ہے۔ وہ حال کا گہرہ امطالعہ کرتا ہے۔ حال کے چوتھی کے مفکروں سے حد نہیں کرتا۔ ان کے قریب ہوتا ہے۔ اقبال کا حال قرآن سے ماخوذ مفکرین کے حوالے سے تحطیم الرجال کا منظر پیش کرتا ہے۔ البتہ قرآن کو بظاہرنہ ماننے والوں کا طوطی بولتا ہے۔ علم کے آسمان پر کئی درخشنده ستارے اقبال کی دنیا میں موجود تھے۔ اقبال نے ان کی فکر کو مسترد کیا نہ نظر انداز بلکہ اپنے وقت کی دوپہر میں بیٹھ کر اور اپنے ”حال“ (وجود) میں آ کر واپس قرآن میں ڈوبے اور پھر ڈوب کر جواہرے تو مسلمانوں کو اور تمام انسانوں کو مستقبل کی کامیاب زندگی کے نسخے جات لے کر سامنے آئے۔ پہ کامیاب نسخے جات کئی پہلوؤں سے سامنے آتے ہیں۔ اقبال کو ہر پڑھنے والے کی اپنی بصیرت ہے کہ وہ انہیں کیسے سمجھتا ہے۔ نسخے جاتِ حیات مسلمان کو یوں بیان کیا جاسکتا ہے۔

تاریخی و رشد کی نشاندہی اور اس پر کار بند رہنے کی تلقین۔

قرآن کتاب انسانیت ہے۔ اس سے انسان کو فائدہ پہنچانا۔

محمد ﷺ سے وفاداری نتائج کی ضامن ہے۔

عظیم کے تناظر میں پاکستان کو آگے بڑھنے اور باقی رہنے کی ایک بنیاد قرار دینا ہے۔

فکر اقبال و شرائط فکر

فکر اقبال: ہمارے مذہبی عقائد اور افکار کی آئینہ دار ہے۔

فکر اقبال: کے اندر حرکت اور نمو کی صلاحیت ہے۔

فکر اقبال: نصب لعینی خصوصیات کی حامل ہے۔

فکر اقبال: ولولہ انگیز، یقین افروز اور انقلاب پرور ہے۔

فکر اقبال: عملیت پسندی اور نتیجہ خیزی کی ضمانت مہیا کرتی ہے۔

فکر اقبال: ہماری زندگی، ہماری آئُدی اور ہماری آزادی کی محافظہ اور نقیب ہے۔

فکر اقبال: ماضی اور حال کی حقیقوں اور مستقبل کی آرزوؤں کی آئینہ دار ہے۔

فکر اقبال: مسلم تاریخی درستہ کا تسلیل و تواتر ہے۔

فکر اقبال: تخلیق پاکستان کا موجب و تواتر ہے۔

فکر اقبال: پاکستان کی روح ہے۔

فکر اقبال: ترقی و بہبود پاکستان کی ضمانت ہے۔

فکر اقبال: فکر مستقبل ہے۔

فکر اقبال: تازہ فکر و تازہ دم ہے۔

پرونا ایک ہی تبعیج میں ان بکھرے دانوں کو
جو مشکل ہے، تو اس مشکل کو آسان کر کے چھوڑوں گا

(بانگ درا)

فکر ایک زنجیر کی مانند ہے۔ اس میں ایک منطقی تدریج پائی جاتی ہے۔ یہ ایک خاص تسلیل سے وابستہ ہوتی ہے۔ زندہ رہنے والی جاندار فکر انہی اوصاف کی مالک ہوتی ہے۔ جن افکار جن میں تدریج و تسلیل کا وصف نہیں ہوگا، وہ روایت و زنجیر فکر کی کڑیاں نہیں بن سکیں گی اور بالآخر کمزور ہو کر تاریخ کے پردے سے مت جائیں گے۔

لفظ چوں از بیت خود بیرون نشد

گوہر مضمون بحیب خود شکت

برگ بزرے او نہال خویش ریخت

از بہاراں تارِ امیدش کیخت

۱۔ جب کوئی لفظ شعر سے باہر ہو جاتا ہے تو وہ گوہر مضمون بے معنی ہو جاتا ہے۔

۲۔ سبز پتا جب اپنے درخت سے گر جاتا ہے تو اس کا تار بہاروں کی امید سے ٹوٹ جاتا ہے۔

تعین فکر کے ذیل میں شرائط فکر و اوصاف فکر کو مد نظر رکھتے ہوئے فکر اقبال پر ایک طائرانہ نگاہ دوڑا میں تو یہ سب کچھ ایک ولولہ انگیز صورت میں فکر اقبال نے عیاں ہیں۔ روایت کی کوئی کڑی ٹوٹی نظر نہیں آتی۔ زنجیر فکر کی کوئی لڑی غائب نہیں۔ اقبال کی نثر ہو یا اردو اور فارسی کا شعری کلام ہو، قرآن ہی کی صوتی آوازیں اٹھتی نظر آتی ہیں۔ قرآن اقبال کی فکر کا محور ہے۔ اقبال نے محور کو اپنی سطح پر لا کر نہیں سمجھا۔ اقبال کی بلند پروازی نے قرآن کو قرآن کے مقام و مذہب کی سطح پر جا

کر دیکھا اور پھر قران کو اپنی تحریروں میں اس شان سے پیش کیا کہ ان میں ولولہ انگیزی، یقین افروزی اور انقلاب پروری کو سمود دیا۔ رسالت کوامت کی شرط اور اس سے وفاداری کو راجح العقیدگی قرار دے کر محمد مصطفیٰ ﷺ کی ذات با برکات سے وفاداری کو اسلام سے وفاداری قرار دیا ہے۔ قرن اول کے بزرگان دین کی دیدہ ریزی کی حسن کمال سے تعریف کی ہے۔ فقہا، صوفیا اور صلحاء کے مقام و مرتبے کو تاریخِ جدید کے تقاضوں کی روشنی میں ان کے کمال فلکر کو اجاگر کرنے کی صلاحیت کو نمایاں کیا ہے۔

آن کتاب زندہ قرآن حکیم
حکمت او لا زوال است و قدیم
حرف او را ریب نے تبدیل نے!
آیہ اش شرمندہ تاویل نے!
نوع انسان را پیام آخری
حامل او رحمتہ للعالمین ﷺ

فکر اقبال..... ہمارے مذہبی عقائد اور افکار کی آئینہ دار ہے

مذہب کا موضوع خدا، کائنات اور انسان ہے۔ جس کو کوئی علم حاصل نہیں، اس کا موضوع بھی خدا ہے اور دنیا کے فلاسفہ، حکماء و علماء کا موضوع بھی خدا ہی رہا ہے۔ دیوتا، قدرت اور خدا اس کہانی کو انسان اسی ترتیب سے سمجھ رہا ہے کائنات کسی غیر مریٰ طاقت کو جانے پر اکساتی ہے۔ پچھر کے دور میں کائنات بہت محدود تھی اور آج جب آفاقیت (گلوبالائزیشن) کا دور ہے تو سمجھنے اور جانے کی کوشش کرنے والوں کو کوئی سراہا تھا نہیں آتا۔ انسان وہ تخلیق ہے جو خدا کی نمود اور کائنات کا مرکزی کردار ہے۔ انسان خدا کو بے حجاب کرنے کے مشن پر کاربند ہے اور یہی اس کا مقصد تخلیق ہے۔ خدا، کائنات اور انسان کو جانے کے لیے اور سمجھنے کے لیے، جو راستے اور ذرائع استعمال کیے جاتے ہیں۔ انہیں ”افکار“ کہا جاتا ہے۔ افکار کا فیض مذاہب اور پھر انسانی عمل و تجربہ ہے۔

وسع و عریض کائنات کے مختلف حصوں میں انسان آباد ہوا۔ وقت کے ساتھ آگے بڑھا۔ بقول

ابن خلدون عصبتیوں نے جنم لینا شروع کیا اور بقول ڈاکٹر برہان احمد فاروقی ان عصبتیوں سے مزاحمت نے جنم لیا اور یوں مزاحمت کی مزاحمت سے خدا کی بے حجابی کا سفر انسان جاری رکھے ہوئے ہے۔

خدا کی بے حجابی کا سفر کہیں رکتا ہے تو دوسرے کسی حصے میں تیزی سے آگے بڑھنے کی استعداد پیدا ہو جاتی ہے۔ ہمارے سامنے کائنات ارضی برعظیم ہندوستان ہے جہاں ایک گروہ (مسلمان) اپنے مذہب کے اصولوں کے مطابق سفر بے حجابی میں آگے بڑھنا چاہتا ہے۔ اس کے راستے میں مزاحمتیں ہیں۔ مزاحمتوں میں کامیابی کے لیے فکر کی پختگی اور طاقت لازمی عنصر ہے۔ اقبال نے اس مزاحمتی عنصر سے نبرد آزمہ ہو کر کامیاب ہونے کے لیے مذہبی فکر کو، ہی بنیاد بنایا ہے۔ اقبال کہتا ہے۔ ”یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ مذہب کی حیثیت دراصل اس اقدام کی ہے جو بالا رادہ اس لیے کیا جاتا ہے کہ ہم اس اصول تک پہنچ سکیں جس پر فی الحقیقت قدرؤں کا دار و مدار ہے اور جن کے سہارے ہم اپنے قوائے ذات کی شیرازہ بندی کر سکیں۔ پھر یہ وہ بات ہے جس کے ثبوت میں دنیا کا سارا مذہبی ادب، علی ہذا کملائے مذہب کے مشاہدات بطور تائید پیش کیے جاسکتے ہیں“۔ لے ”ضرب کلیم“ میں فرماتے ہیں۔

فرنگ سے بہت آگے ہے منزلِ مومن
قدم اٹھا! یہ مقام انتہائے راہ نہیں
(ضرب کلیم)

از یک آئینی مسلمان زندہ است
پیکر ملت ز قرآن زندہ است
(اسرار خودی)

ترجمہ: مسلمان صرف ایک ہی منشور و مرکز کی وجہ سے زندہ ہے۔ وجود ملت قرآن۔ ہے باقی ہے۔

از رسالت در جہاں حکومن ما
از رسالت دین ما آئین ما
از رسالت صد ہزار ما یک است
جزو ما از جزو ما لا یتفک است
(اسرار خودی)

ترجمہ: رسالت سے ہمارا وجود پیدا ہوا اور اسی سے قائم ہے اور رسالت ہی ہمارا ذریعہ اتحاد ہے۔

فکر اقبال کے اندر حرکت اور نمو کی صلاحیت موجود ہے

زندگی اور موت انسان سے وابستہ ہے۔ زندگی سراپا جدوجہد ہے۔ موت بغیر جدوجہد کے معین وقت پر وارد ہو جاتی ہے۔ مگر زندگی کی شاہراہ پر جمود زندگی کی موت ہے۔ زندگی حرکت اور نمو سے عبارت ہے۔ زندگی کی حرکت اور نمو نے زندگی کی نشوونما سے وابستہ ہے۔ یہی زندگی کی تخلیق کا تقاضا ہے۔ انسان کا سفر بھی حرکت اور نمو سے عبارت ہے۔ انسان کو حرکت پر اکسانے اور نمو کو اگلی منزل پر رسائی ایک قوت محرکہ کے ذریعے سرانجام پاتی ہے۔ اسے سادہ لفظوں میں عقیدہ و فکر سے موسوم کیا جاتا ہے۔

حرکت اور نمو فکر اقبال کا خاصا ہے۔ یہ جامد فکر نہیں ہے۔ حکماء و فلاسفہ ثراقبال سے استفادہ کرتے ہیں تو اس کی شاعری سے عوام الناس فیض پاتے ہیں جبکہ سیاسی رہنماء خطبہ اللہ آباد اور ان کے خطوط سے سیاسی بصیرت حاصل کرتے ہیں۔ اقبالستان کا تصور بھی اقبال ہی کی فکر سے جنم لے کر فلسفہ حرکت کی مثال پیش کرتا ہے۔ اقبال کہتا ہے۔

”غور طلب امر قرآن مجید کا وہ مطمئن نظر ہے جو اس نے زندگی کے بارے میں قائم کیا اور جس میں اس کی نگاہیں جمود کے بجائے حرکت پر ہیں..... البتہ ہمیں نہیں بھولنا چاہیے تو یہ کہ زندگی محض تغیر ہی نہیں۔ اس میں حفظ و ثبات کا ایک عنصر بھی موجود ہے۔“^{۱۷}
مزید کہا:-

”علم کی حرکت میں لا اتنا ہی (Infinite) کی یہی موجودگی ہے جس نے متناہی فکر کو ممکن بنا رکھا ہے۔“^{۱۸}

اسی بات کو مزید وضاحت سے بیان کیا：“بہر حال اسلامی فکر نے جوراستہ اختیار کیا ہے اس کی انتہا جس پہلو اور جس رنگ میں بھی دیکھئے، کائنات کے حرکی تصور پر ہوئی اور پھر جسے ابن مسکویہ کے اس نظریے سے کہ زندگی عبارت ہے ایک ارتقائی حرکت سے، مزید تقویت پہنچی۔“^{۱۹}

ضرب کلیم میں کہا:-

دیکھے تو زمانے کو اگر اپنی نظر سے
افلاک منور ہوں تیرے نورِ سحر سے

خورشید کرے کب ضیاءٰ تیرے شر سے
ظاہر تری تقدیر ہو سیماۓ قمر سے

اور مزید کہا:

جرات ہونموجی، تو فضائیگ نہیں ہے
اے مردِ خدا، ملکِ خدا نیگ نہیں ہے

فکر اقبال.....نصب العینی خصوصیات کی حامل فکر ہے

ابتداء و انتہاء اور پست و بلند کا سفر ایک تدریج سے وابستہ ہے۔ تدریج کا یہ سفر ایک مقصدیت سے لگن و جذوبیت کے بل بوتے پرکشنا ہے۔ ہر ابتداء مکال پر ملحوظ ہوتی ہے۔ نصب العین کے تعین کے بغیر کمال نصیب نہیں ہوتا۔ کمال وابستہ ہی نصب العین سے ہے۔ نظم و سلیقه زندگی کے آگے بڑھنے کے ذوق کی نشانی ہے۔ آگے بڑھنے کا ذوق نصب العین سے رغبت پاتا ہے۔ یوں زندگی اپنے ذوق سفر پر رواں رہتی ہے۔

فکر اقبال سے متعلق تمام اہل فکر و قلم کا پختہ خیال ہے کہ اس کے اندر نصب العین سے وابستگی پرشدت سے زور دیا گیا ہے۔ بہار کی امید شجر سے پیوٹگی کے بغیر نہیں رکھی جاسکتی۔ اس کے لیے لازم ہے کہ مقصد نظر وہ سے او جعل نہ ہونے پائے۔

اقبال کی فکر مقصدیت کو اجاگر کرتی ہے۔ اس کے بغیر ان کے ہاں حرکت بے معنی ہے۔
لکھتے ہیں:-

اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کرنا چاہئے کہ جسم کی وضع بھی ان عوامل میں سے ہے جن سے ذہن کی روشن متعین ہوتی ہے۔ لہذا اسلام نے عبادات کے لیے ایک مخصوص ست انتخاب کی تو مخفی اس لیے کہ جماعت کے اندر ایک ہی قسم کے جذبات موجز ہوں۔ ۵

زندگانی را بقا از مدعا است
کارِ دانش را درا از مدعا است
زندگی در جتو پوشیده است
اصل او در آرزو پوشیده است

(اسرار خودی)

(زندگی کی بقاء مقصد یا نصب العین سے وابستہ ہے۔ مقصد زندگی کے لیے بانگ درا کا کام دیتا ہے۔ زندگی کا راز جستجو ہی ہے۔ اس کی حقیقت آرزو میں چھپی ہے)۔

اسرار خودی میں ہی ایک اور جگہ کہا:

چوں ز ربط مدعائے بستہ شد
زندگانی مطلع برخستہ شد
مدعای گرد اگر مہمیز ما
ہمچو صرصرمی رو دشبدیز ما

(زندگی جب کسی نصب العین کے ربط سے وابستہ ہو جاتی ہے تو وہ زندگی کا مطلع یعنی آغاز بن جاتی ہے۔ نصب العین اگر زندگی کی مہمیز بن جائے تو ہمارے گھوڑے کی رفتار صرصرمی طرح تیز ہو جائے)۔

۳۔ فکر اقبال..... ولوہ انگلیزی، یقین افروز اور انقلاب پرور ہے۔

لوہ انگلیزی، یقین افروزی اور انقلاب پروری کسی فکر کے لازمی اجزاء ہیں۔ انقلاب دستور انسانی میں مقصد کی خاطر تبدیلی لانے کا طریقہ ہے جو قطعی ثابت عمل ہے۔ تبدیلی اگر ثبت نتائج کی حامل نہ ہو تو وہ مقصد انسانی کے حصول کیلئے کارآمد نہیں رہتی۔ یقین مقصد کے حصول کی لازمی شرط ہے۔ یقین سے زندگی بنتی ہے اور بے یقینی سے زندگی بر باد ہوتی ہے۔ خدا کائنات اور انسان ایک عقیدہ ہے جس کو ہر مذہب اپنی منطق و تاویل سے یقین افروز طریقے سے پیش کرتا آ رہا ہے۔ بقول ڈاکٹر برہان احمد فاروقی عقیدہ کافر کا بھی اسی قدر مضبوط ہوتا ہے جتنا مسلمان کا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو سارے کافر مسلمان ہو جاتے۔ ولوہ اور جوش زندگی کے مقاصد کے حصول کا ذریعہ ہیں۔ ولوہ ایک ایسی ترقی بلکہ بچل مچاتی آرزو ہے جو آسمانوں پر کنڈیں ڈالنے پر آمادہ کرتی ہے اور اس کے بغیر چین سے نہیں بیٹھنے دیتی۔

لوہ سے یقین کو طاقت ملتی ہے اور یقین کی طاقت سے انقلاب آتا ہے۔ اقبال کی فکرنے برعظیم کے مسلمانوں کے اندر ولوہ و جوش کی ایک ایسی یہ جانی کیفیت پیدا کر دی جس نے انہیں منزل کا یقین عطا کیا اور وہ ”پاکستان“ کی صورت میں ایک عظیم الشان تبدیلی لے آئے۔ کمال اس فکر کا یہ ہے کہ اقبال کی نثر ہو یا اردو و فارسی شعر اب بھی اسی طرح ایک ولوہ تازہ پیدا کر دیتی

ہے۔ ولولہ تازہ کی بلند یوں سے جو یقین ابھرتا ہے اس میں کمی واقع نہیں ہوئی اور یقین کی معراج سے انقلاب کا جو عمل شروع ہوتا ہے وہ زاد راہ سارے کا سارا اقبال کی فکر سے پوری تازگی، شدود مدد اور جوش و خروش سے میسر ہے۔

اقبال کہتا ہے:

خودی کی وہ روشن جو نتیجہ ہے خود ہمارے اندر وون ذات میں زبردست حیاتی تغیرات کا اور جس کو ناممکن ہے منطق کے مقولات اپنے دام میں لاسکیں۔ ان کا اظہار ہو گا تو کسی ایسے عمل سے جو عالم انسانی کو زیر یوز بر کر دے یا پھر یہ کہ ان سے ایک نئی دنیا تعمیر کی جائے۔

وہ سحر جس سے لرزتا ہے شبستان وجود
ہوتی ہے بندہ^ء مومن کی اذال سے پیدا
(ضربِ کلیم)

دلوں میں ولولہ انقلاب ہے پیدا
قریب آ گئی شاید جہاں پیر کی موت
(ضربِ کلیم)

گرم ہو جاتا ہے جب محکوم قوموں کا لہو
تحر تھرا تا ہے جہاں چار سوئے درنگ و بو
(ارمغانِ حجاز)

فکر اقبال..... عملیت پسندی اور نتیجہ خیزی کی ضمانت مہیا کرتی ہے

علم، عمل اور نتائج ایک کامیاب انسانی زندگی کے مدارج اور لائے عمل ہیں۔ انسان کسی وجہ یا اعلت کے شدید دباو پر کسی شے کے بارے میں معلومات حاصل کرنے پر مجبور ہوتا ہے۔ معلومات کی آرزو و جتو علم ہوتا ہے۔ پھر جب معلومات علم کی صورت میں میسر ہو جاتی ہیں تو پھر وہ عمل پر اکساتی ہیں۔ عمل کا معیار و کسوٹی نتائج ہیں۔ بقول ڈاکٹر برہان احمد فاروقی ہر عمل کا ایک رد عمل ہوتا ہے۔ کمال یہ ہے کہ ہر عمل کے ہر رد عمل کی بے خطاب پیش بینی کی جائے تاکہ ثبت نتائج حاصل ہو سکیں۔ جہاں تک اقبال کی فکر کو عملیت اور نتائج کی کسوٹی پر پر کھنے کی بات ہے، ایک

ناخواندہ اور سیاسی سطح پر زوال آمادہ برعظیم کی مسلم قوم کو شعور ذات اور تحفظ کا ایسا شعور بخشش کہ یہ قوم انہتائی سرعت سے تاریخ کو بدل کر ایک نئے نتیجہ خیز مقام کو حاصل کر بیٹھی ہے۔

اقبال نے خوب کہا:

خیال سے زندگی صرف ایک حد تک متاثر ہوتی ہے۔ برعکس اس کے ”عمل“ کو حقیقت سے ایک حرکت زانبست ہے۔ لہذا عمل کا سرچشمہ ہے انسان کا وہ روایہ جو حقیقت کے بارے میں بالعموم مستقلًا اختیار کیا جاتا ہے۔^۲

خواجہ حسن نظامی کو ایک خط میں اپنے ذوق عمل پر اصرار کو یوں بیان کرتے ہیں۔

جب آپ نے مجھے ”سرالوصال“ کا لقب دیا تھا تو میں نے آپ کو لکھا تھا کہ مجھے ”سر الفراق“ کہا جائے۔ اس وقت بھی میرے ذہن میں یہی امتیاز تھا جو حضرت مجدد الف ثانی نے کہا ہے۔^۳

کے خبر کہ جنوں میں کمال اور بھی ہیں
کریں اگر اسے کوہ و کمر سے بیگانہ
(ضرب کلیم)

وہ زمانے کی گردش پہ غالب آتا ہے
جو ہر نفس سے کرے عمر جاؤ داں پیدا
(ضرب کلیم)

فکر اقبال..... ہماری زندگی، ہماری آبرو اور ہماری آزادی کی محافظ

اور نقیب ہے

ولاخوف عليهم ولاهم يحزنون۔ (بقرہ - ۳۸)

”پس ان کے اوپر کوئی خوف ہے اور نہ وہ غم زدہ ہوں“

قرآن حکیم میں یہ آیت ایک سے زائد جگہوں پر وارد ہوئی ہے۔ علم، عمل اور نتائج جس بھی زاویہ سے دیکھا جائے تو خوف و غم سے نجات انسان کا مقصود ہے۔ خوف آنے والے وقوف سے متعلق ہوتا ہے اور غم گذرے ہوئے لمحوں کا ہوتا ہے۔ غم بھی ہوا اور خوف بھی ہو تو زندگی کسی عمل پر

آمادہ نہیں ہوتی۔ کسی جدوجہد میں پڑنے سے گھبراتی ہے، اس لیے آگے نہیں بڑھ سکتی اور نیتیجنے مٹ جاتی ہے۔

زندگی، آبرو اور آزادی انسان کا قیمتی اثاثہ متصور ہوتا ہے۔ خوف و غم میں بستا ہونے کے بعد وہ ان اثاثہ جات کے بارے میں متفسر ہو جاتا ہے۔ وہ ہمیشہ ایسی فکر، ایسی کلید، ایسی فضا یا کسی گوشہ عافیت کی تلاش میں رہتا ہے جو اس کے ان قیمتی اثاثہ جات کی حفاظت کی ضمانت بن سکے۔ اقبال کی فکر نے برعظیم کے مسلمانوں کی زندگی، آبرو اور آزادی کے تحفظ کی ایسی ولولہ انگیز اور انقلاب پرور فکر دی جس نے مختصر عرصے میں وقت کے دھارے بدل دیئے۔ بھارت کے مسلمان کی زندگی، آبرو اور آزادی ایک بار پھر ”ہندو اتنا“ کے نشانے پر ہے لیکن اقبال اپنی جاندار فکر کی بناء پر ابھی زندہ ہے اور وہ تحفظ کی اگلی منزل ”اقبالستان“ کی واضح نشاندہی کرتا ہے۔ اقبال زندگی کو بطور ذات یا خودی قبول کرنے کو اس بات سے جوڑتے ہیں کہ پھر زندگی کی سب خامیوں کو جو اس سے پیدا ہوتی ہیں قبول کرنا ہوتی ہیں۔ وہ لکھتے ہیں۔

قرآن مجید کے نزدیک تو انسان ہونا نام ہی اس بات کا ہے کہ ہر قسم کی سختیاں اور مصائب برداشت کی جائیں..... ممکن ہے اس سے مقصود یہ ہو کہ ہم اپنی خودی میں استحکام پیدا کریں اور یوں اسے ہلاکت اور فنا سے محفوظ رکھیں لیکن پھر یہی وہ مرحلہ ہے جس میں ہم فکر محض کے حدود سے تجاوز کر جاتے ہیں کیونکہ یہیں پہنچ کر ہمارا یہ ایمان کہ انجام کا رغلہ خیر ہی کو ہو گا ایک مذہبی عقیدے کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔^۹

چھلکتی ہے تیری امت کی آبرو اس میں
طرابس کے شہیدوں کا ہے لہو اس میں
(بانگ درا)

ہے زندہ فقط وحدتِ افکار سے ملت
وحدت ہو فنا جس سے وہ الہام بھی الخاد
(ضربِ کلیم)

فکر اقبال ماضی اور حال کی حقیقوں اور مستقبل کی آرزوؤں کا

آئینہ دار ہے

ماضی، حال اور مستقبل ایک علمی کلیہ ہے جس سے ہر شے و علم کے مسائل حل کیے جاتے ہیں۔ انسان ہو یا قوم یا فرد اس کلیے کی رو سے آگے بڑھتا ہے۔ کہاں سے آیا، کیسا ہے اور کہاں جانا ہے۔ یہ سوال انسان کا بھی ہے اور قوم اور فرد کا بھی۔ ”انسان“ کا سوال وسیع ہے۔ عدم سے قدم تک اور ظہور سے غائب ہونے تک ہے۔ اس سے کم تر وسعت قوموں کی حیات و بقاء سے متعلق ہے اور بہت مختصر مدت فرد کی ہے جو بچپن، جوانی اور بڑھاپے کے درمیان پچھ کر بھی گزرتا ہے اور پچھ بھی کرنہیں پاتا۔

یہاں سوال برعظیم میں مسلم قوم کا زیر بحث ہے جس میں ماضی کی درخشان اور زندہ روایات خون بن کر جسد قومی میں دوڑتی ہیں۔ روایات جتنی انسان دوست اور ثابت ہوں حال اسی قدر تو انا اور قد آور بنتا ہے۔ نئی روایات کی نئی بنیاد میں ڈالتا ہے۔ انسان دوست اور نئی ثابت روایات کی طرح ڈالنا دراصل مستقبل کی مضبوط اور محفوظ منصوبہ بندی کرنے کے متادف ہوتا ہے۔

مسلمانوں کی ماضی کی شاندار علم دوست و انسان دوست روایات کا یہ نتیجہ تھا کہ انہوں نے برعظیم کے انسان کو زندگی کے نئے انکشافات سے روشناس کرایا اور جب نئی روایات زیادہ انسان دوست اور علم دوست نہ رہیں تو تاریخ نے کروٹ لے لی۔ مسلمانوں نے تاریخ کی اس کروٹ کو خنده پیشانی سے برداشت کیا۔ نئی صفت بندی کی۔ قرون وسطی کے ماضی اور برعظیم میں ایک ہزار سالہ ماضی کا نئے سرے سے جائزہ لیا۔ حال کی نامساعد صورت کی اپنی حیات و بقاء کے تناظر میں معاملہ فہمی کر کے اپنے مستقبل کو نئے محفوظ راستوں پر لاکھڑا کیا۔

ماضی، حال اور مستقبل کی اس ساری پیچیدہ گتھی کو ایک مردقلندر اقبال نے سمجھایا اور سلبھایا اور اب جہاں کہیں پیچیدگی دوبارہ جنم لیتی ہے تو یہ مردقلندر اس پیچیدگی کو حل کرنے کے لیے موجود ہوتا ہے۔ اقبال ماضی کو بنیاد بناتا ہے۔ حال کا کھلی آنکھوں سے مشاہدہ کرتا ہے اور مستقبل کو وجود انی نظر سے دیکھتا ہے۔ رقمطر از ہیں۔

اجمالاً پوچھئے تو مذہبی زندگی کی تقسیم تین ادوار میں ہو جاتی ہے۔ اس میں پہلا دور عقیدہ کا ہے (Faith)، دوسرا دور فکر کا ہے (Thought)، اور تیسرا دور کشف و عرفان کا ہے (Discovery)۔ تیسرا دور میں انسان میں آرزو پیدا ہوتی ہے کہ وہ حقیقت مطلقہ سے براہ راست اتحاد و اتصال کرے۔ میں یقین کامل کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اسلامیان ہند کسی ایسی تصوریت کا شکار نہیں بنیں گے جو ان کی تہذیبی وحدت کا خاتمه کر دے گی۔ اگر ان کی تہذیبی وحدت محفوظ ہو جائے تو ہم اعتماد کر سکتے ہیں کہ وہ مذہب اور حب الوطنی میں ہم آہنگی پیدا کر لیں گے۔ ॥

افلاک سے آتا ہے نالوں کا جواب آخر
کرتے ہیں خطاب آخر، اٹھتے ہیں حجاب آخر۔
احوال محبت میں کچھ فرق نہیں ایسا
سو ز و تب و تاب اول سو ز و تب و تاب آخر
(بال جبریل)

فکر اقبال..... مسلم تاریخی ورثے کا تسلسل و تواتر ہے

قوم جوز نہ و باقی ہے وہ اس بات کی غماز ہے کہ اس کا ایک تاریخی ورثہ ہو گا کیونکہ یہ آگے بڑھنے کی ایک شرط ہے۔ تاریخی ورثہ ایک ایسی زنجیر کی مانند ہوتا ہے جو ہر دور کی کڑی کے ساتھ آگے بڑھتا ہے۔ جس تاریخی ورثے کی کڑیاں غائب یا کمزور ہوں تو وہ ٹوٹ گرتی ہیں اور پھر وہ قوم صفحہ ہستی سے مت جاتی ہے۔ مسلمان قوم مٹی نہیں اور آثارِ امارتے کے بھی نہیں کیونکہ مسلمان وہ واحد قوم ہے جس کا تاریخی ورثہ دو حصوں میں آگے بڑھتا ہے۔ مسلمانوں کا ایک اہم اور شاندار ورثہ ظہورِ نبوت، نزول قرآن اور مرکز کعبہ سے وابستہ ہے۔ یہ اتنا طاقتور ہے کہ چودہ سو سال سے وقت کے تپھیرے اس میں ذرہ برابر لغزش پیدا نہ کر سکے۔ مسلمانوں کے لیے یہ تاریخی ورثہ مینارہ نور ہے۔ مسلمانوں کے تاریخی ورثے کا دوسرا پہلو اس کردہ ارضی سے جنم لیتا ہے جہاں وہ پیدا ہوتا ہے۔ کردہ ارضی کا کوئی کونہ، کوئی حصہ نہیں ہے جہاں مسلمان نہ بنتے ہوں، کہیں کم ہیں یا زیادہ، ان کی حکومت ہے یا نہیں۔ مگر وہ مقامی طور بھی ایک شاندار تاریخی ورثے کے حامل ہوتے ہیں جو روشنی تو مرکز نور و ہدایت سے لیتا ہے مگر خوشبو مقامی سطح پر بکھیرتا ہے۔ یہی وہ

نہ ہے جو کارگر ہے کہ ہستی ہماری مٹتی نہیں۔ تاریخ میں چند علاقوں سے مسلمانوں کو مٹانے کا تجربہ کیا گیا مگر یہ زیادہ کامیاب نہ ہوسکا۔ اندرس (پین) سے جسمانی طور پر بظاہر مٹا دیا گیا یا بھگا دیا گیا مگر روحانی طور پر اسلام اندرس کے چہے چہے میں اب بھی موجود ہے۔ مسلمانوں کو مٹایا اور بھگایا گیا مگر تہذیب کے نقش اب بھی زندہ ہیں۔ پھر یہ مسلمان مٹ نہ پایا، یہ اور آگے بڑھ گیا۔ طارق بن زیادہ صرف اندرس تک پہنچا تھا مگر اس کی تحریک اب پورے یورپ میں پھیل چکی ہے۔ اندرس سے مٹانا یا بھگانا ہی آج سارے یورپ میں اسلام کے پھیلاوہ کا سبب بنائے ہے۔ اہل بصیرت کے لیے اس میں غور و فکر کا بڑا مواد موجود ہے۔ یہ جن کو مٹانے کا اعلان ہوا تھا یہ کہاں سے جا کر نکلے ہیں۔ گواس پر الگ سے تحقیق مطلوب ہے۔ مگر یہاں یہ مرکزی موضوع نہیں ہے۔ دوسرا روایتی اشتراکیت کی قدرے تازہ مثال ہے۔ روس سے عیسائیت کو نہیں مٹایا گیا۔ اسے سیکولرزم کا نام دیا گیا۔ یہودیت کو نہیں مٹایا گیا۔ انہیں اسرائیل جا کر بسا یا گیا مگر مسلمانوں کو اسلام کا نام لینے سے روک دیا گیا۔ مسجدوں پر تالے ڈال دیئے گئے۔ بظاہر اسلام کا نام سننے کو کان ترس گئے مگر اشتراکیت مسلم تہذیب کو نگل نہ سکی اور خود ٹوٹ گری اور پھر زمانے کی چشم نے نظارہ کیا کہ چھ مسلم آزاد ریاستیں وجود میں آ گئیں۔

یہ ہے تاریخی ورثے کی مختصری کہانی، اقبال نے ایک لمحہ کے لیے بھی مسلم تاریخی ورثے کی طاقت اور ضرورت کو نظر انداز نہیں کیا۔

علامہ اپنے پہلے خطبے میں تسلسل (Serial Time) اور زمان متسلا (Continuum) کے تحت مسلم تاریخی ورثے کی اصل و بنیاد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

یہ لوح محفوظ ہی وہ کل ہے جس میں علم کے جملہ غیر متعین امکانات ایک حقیقت حاضرہ ہی طرح شروع ہی سے موجود ہیں اور جوزمان متسلا میں اپنا اظہار متناہی تصورات کے ایک ایسے تو اتر کی شکل میں کر رہا ہے جس کو دیکھتے ہوئے اندازہ ہو جاتا ہے کہ یہ سب تصور کسی ایک وحدت میں ضم ہو جائیں گے جوابتداء ہی سے ان میں مضمر ہے۔^{۱۲}

درج ذیل الفاظ میں مزید واضح انداز میں مسلم تاریخی ورثے کی تاریخی کڑیوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

جبکہ اسلام کا تعلق ہے ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس کی عقلی اساسات کی جستجو کا آغاز آنحضرت ﷺ کی ذات مبارک ہی سے ہو گیا تھا۔ آپ ہمیشہ دعا فرماتے۔ 'اے اللہ مجھ کو اشیاء کی اصل

حقیقت سے آگاہ کر۔ آگے چل کر صوفیاء اور متكلمین اسلام نے اس سلسلے میں جو خدمات سرانجام دیں وہ ہماری تاریخ ثقافت کا ایک نہایت درجہ سبق آموز باب ہیں۔^{۳۱}

فکر اقبال..... تخلیق پاکستان کا موجب و تواتر ہے

قوموں پر نازک موز آتے ہیں۔ باقی رہنے اور آگے بڑھنے والی اقوام کے لیے نازک موز آگے بڑھنے کی ایک نئی جست کا تقاضا ہوتا ہے۔ ایک نئے درجے یا مرتبے کی نوید ہوتی ہے۔ ایک نئی دنیا اور ایک نئی جدوجہد کا پیغام ہوتا ہے۔ جو قومیں نازک موز کی فلاسفی کو سمجھتی ہوں، وہ ایسے موز پر گھبراتی نہیں ہیں بلکہ پیش آمدہ چیزیں سے پیچیدہ مسئلے کو حل کرنے کے لیے چاق و چوبند اور مستعد رہتی ہیں۔

تخلیق ایک نئی جست، ایک نئے قدم کی محتاج ہوتی ہے۔ یہ کام آسان کبھی نہیں رہا چونکہ یہ سنت الہی ہے۔ اسی نے انسانوں اور قوموں کو بھی یہ استعداد بخشی ہے۔ برعظیم میں ایک خاص موز پر آ کر مسلمانوں کا ارتقاء اور ترقی جمود وزوال کا شکار ہو گئی۔ یہ آخری مغلیہ حکمرانوں کے دور میں شروع ہوتا ہے اور ۷۱۸۵ء میں مکمل ہو جاتا ہے۔ اس موز پر رک کر فنا ہو جانا تھا یا تخلیق کی جست سے آگے بڑھ جانا تھا۔ مسلمانوں نے مٹا نہیں تھا۔ اس لیے تخلیقی جست کی استعداد کو استعمال کیا۔ سر سید احمد خان نے جمود کی برف کو پکھلا یا اور علامہ محمد اقبال نے تخلیقی جست کی راہ عمل بھائی۔ قوم نے اسے درست مانا اور جدوجہد کی۔ آن واحد میں بکھرا بکھرا اور بے ترتیب جم غیر "تخلیق پاکستان" کا موجب بن گیا۔ یہ برعظیم میں مسلمانوں کے باقی رہنے اور آگے بڑھنے کے عمل میں ایک تخلیقی جست تھی۔ یاد رہے پاکستان آگے بڑھنے کی استعداد سے محروم ہو کر آگے نہیں بڑھ پاتا یا برعظیم کا مسلمان خصوصی طور پر موجودہ بھارت کا مسلمان آگے بڑھنے سے روک دیا جاتا ہے یا اسے فتا ہونے یا کرنے کا عند یہ مل جاتا ہے تو توقع رکھنی چاہیے کہ یہ نئی تخلیقی جست "اقبالستان" کی ہو سکتی ہے۔ (اس عنوان کے تحت فرمودا ت اقبال کی تائید خطبه الہ آباد کی توجیہہ و تشریع کے عنوان سے دیکھی جاسکتی ہے)۔

فکر اقبال..... پاکستان کی روح ہے

انسان کا اپنے متعلق عام مشاہدہ انسانی "جسم و روح" کی ترکیب سے سمجھا اور سمجھایا جاتا ہے۔ روح زندگی ہوتی ہے بلکہ وہی زندگی ہے۔ وہ نظر آتی بھی ہے اور نظر نہیں بھی آتی۔ اس کی اہمیت کے بہت سے دلائل ہیں بھی اور کوئی دلیل بھی نہیں مگر ابدی ہے۔ جسم مشاہدے کی چیز ہے۔ نظر آتا بھی ہے اور دلائل بھی ہیں مگر عارضی ہے۔

جسم ایک ڈھانچہ یا آلہ ہے جسے ہر کوئی اٹھائے پھرتا ہے۔ یہ روح جب جسم کا ساتھ چھوڑ دیتی ہے تو پھر گویا حقیقت کچھ باقی نہیں پختی جو جسم کے مشاہدے سے نظر آتی ہو۔ حکماء و علماء جانتے ہیں کہ اقوام کے اجتماعی نظم کی پختگی و ترقی اور بلندی کسی خاص فکری طاقت سے وابستہ ہوتی ہے۔ روح جسم انسانی کی پختگی، ترقی اور بلندی کی ضرورت اور شرط اولیں ہے۔ بعینہ فکری طاقت اقوام کے اجتماعی نظم کی سلیقہ نوازی کی ضرورت ہے۔

"پاکستان" کے جسد قومی کی روح فکر اقبال کی طاقت ہے۔ فکر اقبال جسم پاکستان کی روح ہے۔ اسے الگ کرنے یا کمزور کرنے کا مطلب پاکستان کے جسد قومی کو کمزور کرنا ہے اور پاکستان کی مقدارہ اسے کمزور کرنے کی مرکب ہوئی ہے۔ (فرمودات اقبال کے لیے خطبه اللہ آباد کی توجیہہ و توضیح کے تحت عنوان ملاحظہ کریں)۔

فکر اقبال..... ترقی و بہبود پاکستان کی صہانت ہے

ترقی و بہبود انسان کی ضرورت اور تقاضا ہے۔ یہ بات تاریخ میں پہلے نظر انداز ہوئی اور نہ مقاصد رسالت و قرآن میں نظر انداز ہوئی۔ ترقی و بہبود مقاصد انسانی کو آگے بڑھانے کی ایک شرط ہے۔ ترقی و بہبود سے طاقت حاصل ہوتی ہے اور طاقت آگے بڑھنے کی ایک شرط ہے۔ ان شرائط پر پورا اترے بغیر آگے بڑھنے کی آرزو پوری نہیں ہوتی۔

مادی اور روحانی کی تقسیم مسئلے کو سمجھنے کے لیے تھی۔ ان میں سے کسی ایک کونصب العین قرار دینا اور دوسرے کو مسترد کرنا نتائج میں تذبذب پیدا کرنے کے مترادف ہے۔ ایک وقت امت مسلمہ پر ابرا آبا کہ اس نے مادی اور روحانی قوتوں کو کیجا کر کے قوت حاصل کی اور انسان کو ترقی و بہبود کی نئی راہوں پر لاڑا۔ پھر زوال نے ڈیرہ ڈالا تو ہم مجرد شریعت یا دوسرے لفظوں میں زندگی

کے صرف روحانی پہلو پر اکتفا کر بیٹھے اور زندگی میں ترقی و بہبود کے تصور کو مسترد کر دیا جس کا نتیجہ آج یہ ہے کہ ہم انسانی زندگی کی ترقی و بہبود کے لیے مناسب مادی استعداد سے محروم ہیں۔

مادیت بھی ایک قوت ہے اور روحانیت بھی ایک قوت ہے۔ مادیت بغیر روحانیت کے چنگیزی بن جاتی ہے اور روحانیت بغیر مادیت کے انسان کی ترقی و بہبود کے دستور پر عمل پیرا نہیں رہتی۔ دوسرے لفظوں میں روحانیت مادیت کو ثابت سمت پر رکھتی ہے اور مادیت بغیر روحانیت کے منفی ہو جاتی ہے۔

پاکستان قائم رہ سکتا ہے نہ آگے بڑھ سکتا ہے اگر اس میں بنے والے انسانوں کی بغیر کسی مذہبی، علاقائی، لسانی اور نسلی تعصُّب کے ترقی و بہبود کو ممکن نہیں بنایا جاتا۔ قیام پاکستان کے بعد کی تاریخ کسی طور پر قابلِ رشک نہیں ہے۔ پاکستان میں کسی میدان میں ترقی و بہبود کا مقصد حاصل نہیں ہو سکا۔ پاکستان میں بنے والے انسان کی زندگی کی مشکلات بہت زیادہ ہیں اور آسانیاں پیدا کرنے کی طرف قومی رجحان سرے سے نہیں ہے۔

پاکستان کی تخلیق کا موجب ایک فکر تھی۔ اس فکر نے ایک ناخواندہ قوم میں قوت کی وہ بجلیاں آنافاناً پیدا کر دیں لیکن قیام پاکستان کے بعد اس بجلیاں دوڑانے والی فکر کو دانستہ روکا گیا۔ پاکستان جس کا خیال تھا عمل کی را ہیں بھی اس نے طے کر دی تھیں۔ فکر اقبال پاکستان کی ترقی و بہبود کی ضمانت تھی اور ترقی و بہبود کی ضمانت ہے۔ (فرمودات اقبال کے لیے: خطبهٗ اللہ آباد کی تشریع کے ضمن میں عنوان کا مطالعہ کریں)

فکر اقبال..... فکر مستقبل ہے

فکر جاندار ہو تو حال بتتا ہے اور مستقبل کی منصوبہ بندی ہو جاتی ہے۔ مستقبل کی منصوبہ بندی مستقبل میں ممکن نہیں رہتی کیونکہ تب وہ حال ہوتا ہے۔ زوال کے بعد پوری امت کی سطح پر ہمارا حال یہ ہے کہ مستقبل کی ٹھوس منصوبہ بندی نہیں کی جاتی۔ یہی وجہ ہے کہ امت مسلمہ جب ذرا آگے بڑھتی ہے تو روک دی جاتی ہے کیونکہ رکاوٹ دور کرنے کی کوئی سہیل تیار نہیں ہوتی۔ افسونا کی بات یہ ہے کہ قیام پاکستان کے بعد ریاستی سطح پر مستقبل کے حوالے سے کوئی موثر منصوبہ بندی نہیں ہے۔ میں الاقوامی کارگر اور استعماری طاقتوں نے قیام پاکستان و بھارت کے ساتھ ہی ایسی منصوبہ بندی کر دی تھی کہ یہ دونوں ریاستیں حال میں دست و گریباں اور جنگ وجدل میں مشغول رہیں اور یوں مستقبل

کے بارے میں سوچنے کی ان کو فرصت، ہی نہ ملے۔ یہ تو تین پاکستان کی حد تک کامیاب ہیں۔ البتہ بھارت نے جہاں کشمیر کے حوالے سے خصوصی طور پر پاکستان کو دشمن نمبر اقرار دیئے رکھا وہاں انہوں نے دھیرے دھیرے ”ہندو اتا“ کے مقاصد کو بھی پوری منصوبہ بندی سے آگے بڑھایا اور جس کے نتائج اب سامنے بھی آ رہے ہیں جبکہ پاکستان نے بھارت کو دشمن نمبر اتو قرار دیئے رکھا مگر دشمنی کے اس ماحول میں آگے بڑھنے کے لیے جس تھوڑے منصوبہ بندی کی ضرورت تھی، وہ نہ کی جاسکی۔ کشمیر بھی نہ ملا اور پاکستان میں رہنے والوں کو بھی غربت کی گہرائیوں میں دبا کر ان کی انسانی صلاحیتوں کو روگ دے دیا۔ اقبال جس نے محفوظ مستقبل کی فکر دی تھی، اس کو ہم نے جز سے اکھاڑ کر پھینک دیا۔ فوج نے بار بار مداخلت کر کے عوامی سطح پر قوم کے فکری سفر کو آگے بڑھنے، ہی نہیں دیا۔ فکر گھوڑوں، خچروں، گاڑیوں، توپوں، جہازوں پر سفر نہیں کرتی، اس کا تعلق اذہان سے ہوتا ہے، اس کو روکنے سے جو نتائج سامنے آتے ہیں وہ ہم اب دیکھ رہے ہیں۔

فکر اقبال ماضی کا تسلسل ہے۔ فکر اقبال حال کی جاندار فکر ہے اور فکر اقبال مستقبل کی کامیابی کی ولولہ انگیز اور تازہ دم فکر ہے۔ (مزید فکر اقبال فکر مستقبل ہے کے عنوان کے تحت دیکھیں)۔

فکر اقبال.....تازہ فکر و تازہ دم ہے

قوموں کی جدوجہد اور تعمیر میں افکار بنیادی کردار ادا کرتے ہیں۔ افکار کی زندگی اور پاسیداری کی شرط یہ ہے کہ وہ نتائج دینے کی قوت رکھتے ہوں اور تجربات اس پر گواہ ہیں۔ افکار بوسیدہ نہیں ہوتے جب تک وہ خون بن کر قوموں کی زندگی میں دوڑتے رہیں افکار کی طاقت ماضی میں پیوست ہوتی ہے۔ ماضی سے تسلسل و تواتر کے ساتھ ابھرنے والے افکار ہمیشہ تازہ ہوتے ہیں کیونکہ وہ حال میں کھلتے ہیں۔ افکار جو حال میں ماضی سے پیوٹگی کی بناء پر نتائج دیتے ہیں، وہ بوسیدہ نہیں ہو سکتے، وہ آگے بڑھتے ہیں۔

تازہ دم وہ افکار ہوتے ہیں جو نصب العین کا شعور دیں، جدوجہد کا داعیہ پیدا کریں، جوش و و لوہ عطا کریں، انقلاب پروری کا یقین دلائیں۔ اقبال کی فکر تازہ فکر اس لیے ہے کہ ماضی قریب میں اس نے نتائج دیئے ہیں کوئی اور اقبال جنم نہ لے سکا کیونکہ فکر اقبال ابھی تک پوری طرح تازہ ہے۔ پوری طرح پر جوش ہے، انقلاب انگیز ہے۔ انقلاب ایران کی مثال ہمارے سامنے ہے جس میں سب سے زیادہ اور اہم فکری کردار علامہ اقبال کے فارسی کلام کا ہے جس نے وہ قوت بخشی کہ ایرانی قوم ایک

انقلاب پرور قوم بن گئی۔ آپ انقلاب ایران کی ماهیت سے اختلاف کر سکتے ہیں مگر اقبال کے کلام نے ایک نصب العین کے لیے جو تڑپ ایرانیوں میں پیدا کر دی ہے اس سے انکار ممکن نہیں ہے۔ اقبال زندہ ہے، اس کی فکر زندہ ہے، اس کی فکر پوری طرح مستعد اور تازہ دم ہے، کسی اور بڑی تبدیلی کی اور بڑے انقلاب کی قوت سے پوری طرح لیس ہے اور یہ انقلاب "اقبالستان" بھی ہو سکتا ہے۔ اس عنوان کے آخر میں یہ وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے کہ فکر اقبال کو مرکزی فکر قرار دیتے ہوئے وہ سارے لازمی عناصر پوری طرح مرکز نگاہ رہنے چاہیں جو فکر کو وقت کے ساتھ حرکت دیتے رہتے ہیں یعنی حرکت اور نمو جو فکر کو وقت کے ساتھ ہم آہنگ رکھتی ہے مد نظر رہنی چاہیے۔

جہاں تازہ کی افکار تازہ سے ہے نمود
کہ سنگ و خشت سے ہوتے نہیں جہاں پیدا
وہی زمانے کی گردش پہ غالب آتا ہے
جو ہر نفس سے کرے عمر جاؤ داں پیدا
(ضرب کلیم)

حوالی

- ۱۔ علامہ اقبال، تشکیل جدید الہیات اسلامیہ، بزم اقبال، لاہور، ۱۹۹۸ء ساتواں خطبہ، ص نمبر ۲۹۳
- ۲۔ علامہ اقبال، تشکیل جدید الہیات اسلامیہ، بزم اقبال، لاہور، چھٹا خطبہ، ص نمبر ۷۵
- ۳۔ علامہ اقبال، تشکیل جدید الہیات اسلامیہ، بزم اقبال، لاہور، پہلا خطبہ، ص نمبر ۱۰۱
- ۴۔ علامہ اقبال، تشکیل جدید الہیات اسلامیہ، بزم اقبال، لاہور، پانچواں خطبہ، ص نمبر ۲۱۱
- ۵۔ علامہ اقبال، تشکیل جدید الہیات اسلامیہ، بزم اقبال، لاہور، تیسرا خطبہ، ص نمبر ۱۳۰
- ۶۔ علامہ اقبال، تشکیل جدید الہیات اسلامیہ، بزم اقبال، لاہور، ساتواں خطبہ، ص نمبر ۲۸۳
- ۷۔ علامہ اقبال، تشکیل جدید الہیات اسلامیہ، بزم اقبال، لاہور، ساتواں خطبہ، ص نمبر ۲۸۶
- ۸۔ محمد شفیع بلوج، اقبالیات، جولائی ۲۰۰۱ ص نمبر ۳۸
- ۹۔ علامہ قبال، خطبات، تیسرا خطبہ، ص نمبر ۱۳۳
- ۱۰۔ خطبات، اقبال اکڈیمی، ساتواں خطبہ، ص نمبر ۲۷۸
- ۱۱۔ حرف اقبال، ص نمبر ۱۱۲
- ۱۲۔ خطبات، خطبہ اول، ص نمبر ۹-۱۰
- ۱۳۔ خطبات، بزم اقبال، ۱۹۵۸ء، ص نمبر ۲

فکر اقبال، ہی فکر مستقبل ہے

حقائق اور معارف کی دنیا نے نو میں اقبال آدم نو کی حیثیت رکھتا ہے۔ وہ ایک نیا انسان ہے جس نے نئی دنیا کی بنیاد رکھی۔ اقبال اب صرف ایک نام ہی نہیں بلکہ ایک مستقل ادارہ، ایک منظم سلسلہ خیال، ایک مخصوص طرز فکر، زندگی کی ایک بین تعبیر، اسلام کی ایک واضح تفسیر اور ملت اسلامیہ کا ایک جاذب نقطہ نظر بن چکا ہے۔ اقبال فطرت کا نباش ہے، زندگی کا مبصر ہے، اسلامی نظام حیات کا شارح ہے اور نہ صرف قرن حاضر کا بلکہ تمام ادوار کا مفکر اعظم ہے۔ اقبال ایک ایسا شاعر ہے جس نے حیات کے بحربے پایاں میں غوطہ زن ہو کر ابدی صداقتوں کے جواہر ریزے نکالے، جس نے زندگی کے ساز پر انسان کے روشن مستقبل کے وجہ انگیز راگ چھیڑے، جس نے انسان کی لا انتہاء صلاحیتوں کا جائزہ لیا، جس کے ناخن فکر نے بے پناہ امکانات کی گھٹیاں سلبھائیں، جس کے وجہان نے خیر و شر کو صحیح معیار بخشنا، جس کی نگاہ پرده درنے والش حاضر کی کوتا ہیوں کا پرده چاک کر کے رکھ دیا، جس نے مشرق و مغرب کی سیاست گمراہ کولکارا، جس کی نگاہ عُمیق نے روح مذہب کی اتحاد گہرائیوں کو پالیا، جس نے ہماری سکتی ہوئی معاشرت کے زخموں پر مر ہم رکھا، ہمارے لڑکھراتے ہوئے تمدن کو سہارا دیا اور ہمارے آئندہ عروج و ترقی کے لامحدود امکانات کی نشاندہی کی۔

فکر اقبال، ہی فکر مستقبل ہے؟ مضبوط اور ٹھوس دلائل ہی اس دعوے کے درست یا غلط ہونے کا فیصلہ کر سکتے ہیں۔ اقبال کی فکر اور اس کے ہم عصر نمایاں ترین اہل علم و فکر کی علیمت و معقولیت، قوت و قبولیت اور عملیت و نتائجیت کے حوالے سے موازنہ و تجزیہ ایسا پیمانہ و معیار ہو سکتا ہے جس کی رو سے صورتحال کی وضاحت احسن انداز سے ہو سکے گی۔ ان سطور میں انہی نمایاں شخصیات سے

موازنہ و تجزیہ مقصود ہے جو تحریک پاکستان کے دوران اور قیام پاکستان کے بعد ایک نمایاں فکری و علمی حلقے یا ادارے کے ساتھ سیاسی رہنمائی کے میدان میں بھی اہم مقام رکھتے تھے اور اقبال کی فکر سے متفق نہیں تھے۔ ان میں نمایاں ترین شخصیات مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا حسین احمد مدینی، مولانا عبید اللہ سندھی اور مولانا ابوالاعلیٰ مودودی شامل ہیں۔

مذکورہ چاروں شخصیات دینی پس منظر میں انتہائی اعلیٰ مقام و مرتبے کی حامل تھیں اور دینی حلقوں میں ان کے اثرات اب بھی کم و بیش باقی ہیں۔ بعظیم پاک و ہند کے مسلمانوں کی سیاسی رہنمائی بھی زیادہ تر انہی مکاتب فکر کے تحت چلی آ رہی تھی۔ مسلمانوں کا ہندوستان بھر میں علمی اداروں و حلقوں اور رابطوں کا جو ایک منظم سلسلہ تھا، وہ زیادہ تر علماء و صوفیاء کے مدرسے اور خانقاہوں کے تحت تھا۔ بلاشبہ یہ ایک مضبوط نیٹ ورک تھا جو مکمل طور پر ان بزرگوں کے کنٹرول میں تھا۔

۷۱۸۵ء مسلمانوں کی تاریخ کا بڑا اہم واقعہ تھا کیونکہ مسلمانوں کو ایک واضح شکست ہی نہیں ہوئی تھی بلکہ ایک زوال کی تکلیف وہ صورت حال کی شروعات بھی تھیں۔ تاریخ کا یہی وہ طوفان انگیز مؤثر ہے جہاں ہندوستان کے مسلمانوں کو اپنی روایت، اپنی تاریخ، اپنی حیات، اپنی بقاء اور اپنے مستقبل کے سارے فیصلے بالکل نئے انداز میں کرنا تھے۔ یہ تسلیم کیے بغیر چارہ نہیں کہ مستقبل کے نئے انڈیشوں کو مدنظر رکھتے ہوئے روایت اور تاریخ سے بغاوت آمیز فکر کے او لیں باñی سر سید احمد خان تھے۔ روایت و تاریخ سے بغاوت آمیز فکر کا اور وہ آسانی سے ہضم نہیں ہوتا۔ سو سر سید احمد خان کو شدید مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا جو ایے حالات کا لازمی ر عمل ہوتا ہے۔

ای بغاوت آمیز فکر کا اگلار عمل مسلمانوں کا جدا گانہ وجود اور ”ایک بھارتی وفاق کے تحت مسلمان“ کا معنکر کہ پڑا۔ ”متحده ہندوستان“ کے الفاظ اس وقت اس بحث کا عنوان تھا جسے ”ایک بھارتی وفاق کے تحت مسلمان“ کو ان سطور میں بیان کیا گیا ہے۔ اس کے مقابلے میں ” تقسیم ہند“ کا لفظ استعمال کر کے ” تقسیم“ کے لفظ کی کمزوری کو نمایاں کر کے سیاسی حمایت حاصل کرنے کی سعی تھی۔ ان سطور کا مصنف یہ سمجھتا ہے کہ ہندوستان تقسیم ہی نہیں ہوا۔ زمینی لحاظ سے یہ تب بھی متحده تھا اور اب بھی اسی طرح ہے۔ سیاسی لحاظ سے تاریخ کے کسی دور میں یہ ایک اکائی نہیں رہی ہے۔ حکومتوں کا دائرہ کار سکرٹری اور پھیلتار ہا ہے۔ علاقے اور ریاستیں اپنے قد کاٹھ اور طاقت کی بناء پر کبھی وفاق کا حصہ اور کبھی خود مختار رہتے تھے۔ بھارت نے اب بھی ۲۰ ریاستیں بنارکھی ہیں۔ یہ وفاق کے تحت ہیں جبکہ پاکستان، بنگلہ دیش، نیپال اور بھومنان ہندوستان میں ہی آزاد و خود مختار

ریاستیں ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ یہ بھارتی وفاق کے تحت نہیں ہیں۔

ہندوستان میں مسلمانوں کے جدا گانہ وجود کی حقیقت و حیثیت کی نمائندگی اقبال نے کی اور ایک بھارتی وفاق کے تحت (متحده ہندوستان) مسلمانوں کی نمائندگی مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا حسین احمد مدنی، مولانا عبد اللہ سندھی اور مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے کی۔ (مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے قیام پاکستان کے بعد ”پاکستان“ کی مخالفت ترک کر دی تھی)۔

یہ معرکہ ۱۹۰۶ء کو مسلم لیگ کے قیام سے لے کر ۱۹۴۷ء تک لڑا گیا۔ دلائل کی خوب معز کہ آرائیاں ہوئیں۔ بحث و مباحثے کے کئی میدان بجے۔ بالآخر ایک نتیجہ سامنے آ گیا۔ ہند میں مسلمانوں کی جدا گانہ حیثیت کا موقف تسلیم کر لیا گیا۔ پاکستان وجود میں آ گیا۔ گویا اسلام کی نمائندگی، مسلمانوں کی رہنمائی، علمی امامت کی بلا شرکت غیرے رہنمائی کرنے والے شکست فاش کھا گئے۔ اسلام کی جوتازہ تعبیر و تشریع علامہ اقبال نے کی، عوام نے اس کو تائید بخشی اور اسلام کے حوالے سے ان رہنماؤں کی حیثیت کو چیلنج کر دیا۔ سیاسی افکار اور مستقبل کی رہنمائی کے میدان میں اقبال کی پیروی میں انگریزوں و ہندوؤں کے ساتھ فیصلہ کن معرکہ لڑا گیا۔ مذکورہ علماء نے سارا وزن کانگرس کے پلٹرے میں ڈال دیا۔ مسلمانوں کو اپنی پیروی میں رکھنے کے سارے جتن کیے جبکہ اقبال کے افکار کی نمائندگی مسلم لیگ اور قیادت بالکل ایک نئے فرد محمد علی جناح نے کی۔ میدان اور نتیجہ دونوں اقبال کے ہاتھوں میں رہے۔

ہند میں مسلمانوں کی جدا گانہ حیثیت پر اقبال کا موقف اس طور میں بہ تکرار بیان ہوا ہے۔ خطبہ اللہ آباد کا خصوصی تحریز بھی شامل تحریر ہے۔ جہاں تک ان بزرگوں کے موقف کا تعلق ہے ان پر تفصیلی بحث کا یہ موقع نہیں ہے۔ البتہ آج کے قاری کے لیے اس کی مختصر نشاندہی کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے تاکہ اقبال کی فکر کی اہمیت معلوم ہو سکے۔ پروفیسر فتح محمد ملک نے مولانا ابوالکلام آزاد اور اقبال کے تصور قومیت کا موازنہ اپنے ایک مضمون میں کیا ہے اور مزید وضاحت کیلئے ایک کتاب کی بھی نشاندہی کی ہے۔ میں یہاں اُسی پر اکتفا کروں گا۔ انھوں نے لکھا

”تحریک خلافت سے قیام پاکستان تک مولانا آزاد ہندو مسلم اتحاد ہی نہیں بلکہ ہندوؤں اور مسلمانوں کی ”امت واحدہ“، یعنی متحده ہندوستانی قومیت کے تصور کا پرچار کرتے رہے۔ وہ مسلمانوں کے الگ قومی وجود کو ہندوؤں کے قومی وجود میں جذب کر دینے کے لیے مذہبی دلائل اور شرعی حیلے تراشتے رہے۔ اگر آپ سیدہ سیدین حمید کی کتاب Islamic Seal on India's Independence (آ. کسفور ۱۹۹۸ء) کی ورق گردانی کریں تو ان تمام دلائل اور حیل کی تفصیلات

آپ کے سامنے آ جائیں گی۔ ۲

پروفیسر فتح محمد ملک کے اس تجزیے کو سمجھنے کے لیے مولانا ابوالکلام آزاد کی اپنی کتاب India Wins Freedom (آزادی ہند) دیکھی جاسکتی ہے۔ مولانا آزاد بعد از تشكیل پاکستان ایک بھرپور تبصرہ کرتے ہیں اور قیام پاکستان کی حقیقت کو تسلیم کرنے یا یقین کرنے میں شامل محسوس کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں۔

اس طرح ہندوستان نے اپنی آزادی حاصل کر لی مگر اپنی وحدت کھو دی۔ ۳

پاکستان کی تخلیق کا واحد نتیجہ بر صیر ہندوستان کے مسلمانوں کی پوزیشن کو کم کرنا تھا۔ سائز ہے چار کروڑ مسلمان جو ہندوستان میں رہ گئے وہ کمزور ہو گئے ہیں۔ ۴

کیا کسی کو انکار ہو سکتا ہے کہ پاکستان کی تخلیق نے فرقہ درانہ مسئلے کو حل نہیں کیا بلکہ اسے اور شدید اور ضرر رسان بنادیا ہے۔ ۵

ایسا لگتا ہے کہ مسٹر جناح اور ان کے مقلدوں نے سمجھا ہی نہیں کہ جغرافیہ ان کے خلاف تھا۔ ۶

مولانا عبد اللہ سندھی بھی ایک معرکتہ ال آر اشخاصیت تھے۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے حوالے سے ان کا کام اور نام نمایاں ہے۔ فتح محمد ملک نے مذکورہ مضمون میں ان کے حوالے سے لکھا ہے۔

مولانا سندھی نے ترکی میں اپنی جلاوطنی کے زمانے میں ہی اسلامی اتحاد کے خوابوں سے دستبرداری کا کھلم کھلا اعلان کر دیا تھا۔ اتنبول سے انہوں نے ریاست ہائے متحدہ ہندوستان کا جو خاکہ شائع کیا تھا اس میں انہوں نے یہ اعلان کیا تھا کہ ان کی جلاوطن سوراجیہ ہند پارٹی، انڈین نیشنل کانگرس ہی کا ایک ذیلی گروہ ہے جو مذہب کو فقط ذاتی زندگی کے دائرے تک محدود رکھتے ہوئے لسانی اور جغرافیائی بنیادوں پر ہندوستان کو دس ریاستوں کے ایک وفاق کی صورت میں متحد رکھنے کا خواہاں ہے۔ اسلامیان ہند میں قرارداد پاکستان کی روزافزوں مقبولیت کے زمانے میں جب انہوں نے ”جمنا، بر بد، سندھ، ساگر پارٹی“ قائم کی تب بھی ایک متحدہ ہندوستان کی بقاء، ہی کو اپنایا مسلک قرار دیا۔ ۷

جبکہ مولانا مودودی نے بعد از قیام پاکستان مخالفت ترک کر دی اور اپنی تحریر و تحریک کے ذریعے تعمیر پاکستان میں مشغول ہوئے لیکن یہ تسلیم کیے بغیر کہ متحدہ ہندوستان کی حمایت کر کے انہوں نے غلطی کی تھی، اس غلطی کو تسلیم نہ کرنے سے ان کی فکر اقبال سے الگ ہوتی گئی اور اسی تحریر میں فکر اقبال کی جگہ فکر مودودی کو منظم طریقے سے داخل کرنے کے نقصانات اور نتائج زیر بحث

آئے ہیں۔ یہاں تین آراء کو بیان کرنے سے صورتحال کی قدرے وضاحت ہو جائے گی۔ فتح محمد ملک نے چوتھی شخصیت مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کو لے کر بیان کیا ہے

سید ابوالاعلیٰ مودودی نے ”مسئلہ قومیت“ کے عنوان سے اپنے کتاب پچ میں جدا گانہ مسلمان قومیت سیاست ہر نوع کی قومیت کو اسلام سے متصادم نہ ہرا یا اور تحریک پاکستان کے حامیوں اور رہنماؤں کو بھی کانگری مسلمانوں ہی کی مانند گروں زدنی نہ ہرا یا، مودودی صاحب کے خیال میں اسلام اور قومیت میں بنیادی تفاضل ہے۔ اپنی کتاب مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش کی جلد سوم میں انہوں نے ” جدا گانہ مسلم قومیت (یعنی پاکستان)“ کے تصور کو ایک غیر اسلامی بلکہ اسلام دشمن تصور، قرار دیا ہے۔

مولانا حسین احمد مدنی اور اقبال کے حوالے سے بحث اگلے صفحات پر آئے گی۔ مولانا حسین احمد مدنی دارالعلوم دیوبند کے سربراہ تھے اور جید علماء میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ وہ بھی ”ایک بھارت کے تحت مسلمان“ کے تصور کے سب سے بڑے پرچارک تھے۔

جبکہ پروفیسر فتح محمد ملک نے مذکورہ مضمون میں ایم۔ اے ایچ اصفہانی کی کتاب ”قائد اعظم۔ ایز آئی نیویم“ کے حوالے سے چونکا دینے والی بات نوٹ کی ہے جو انہوں نے کل ہند مسلم لیگ کے ۱۹۳۶ء کے پارلیمانی بورڈ کے اجلاس منعقدہ لاہور کی یادیں قلمبند کرتے ہوئے لکھا ہے۔

مجھے یاد ہے کہ پہلے روز مفتی کفایت اللہ اور مولانا حسین احمد مدنی نے مسٹر جناح کی حمایت کرتے ہوئے مسلم لیگ کو عملی سیاست کے اکھاڑے میں زیادہ فعال حصہ لینے کی تجویز کا خیر مقدم کیا مگر آخری روز ان دو علماء دین میں سے ایک نے تجویز پیش کی کہ آئندہ عام انتخابات میں مسلم لیگ کی کامیابی کو یقینی بنانے کی خاطر انتحک اور موثر پر اپیگنڈے کی ضرورت ہے۔ اس مقصد کے حصول کی خاطر دیوبند کی مشینی مسلم لیگ کے لیے وقف کی جاسکتی ہے بشرطیکہ لیگ اس پر اپیگنڈہ مہم کے اخراجات برداشت کرے۔ ابتدائی اخراجات کے لیے پچاس ہزار روپے طلب کیے گئے۔ جناب نے صاف بتا دیا کہ نہ تو اس وقت لیگ اتنے پیسے دے سکتی ہے اور نہ آئندہ اس کی توقع ہے۔ اس پر ہر دو علماء دین مایوس ہو کر ہندو کانگرس کی طرف راغب ہو گئے۔ ہندو کانگرس چونکہ مالی اعانت کا مطالبه پورا کر سکتی تھی۔ اس لیے اس کا خوب پر اپیگنڈہ کیا گیا۔^۸

ڈاکٹر اسرار احمد جو مولانا مودودی کے ہم سفر رہے، لکھتے ہیں۔

کہ شروع شروع میں مولانا مودودی بھی وطنی قومیت کی مخالفت میں مسلم قوم پرستی کی انہتا تک پہنچ گئے تھے لیکن مولانا امین احسن اصلاحی کی شدید تنقید کی وجہ سے وہ جلد ہی سنبل گئے اور جب انہوں نے مسلم قومیت کے نظریہ کو ترک کر کے اسلامی قومیت کے نظریہ کو اپنا لیا تو مولانا مودودی اور مولانا اصلاحی کے مابین اتحاد و تعاون کی راہ ہموار ہو گئی اور اسی اسلامی قومیت کی بنیاد پر ہی جماعت اسلامی کی بنیاد رکھی گئی جس نے تحریک پاکستان کے دوران نہ مسلم لیگ کا ساتھ دیا اور نہ ہی قیام پاکستان میں کوئی دلچسپی لی۔^۹

جبکہ مولانا مودودی کے ایک عقیدت مندرجہ ذیل مظفر حسین نے لکھا۔

علامہ اقبال پیش رو سید مودودی تھے اور ہمیں یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ فکر مودودی کا سرچشمہ فکر اقبال ہے۔ یہ بات بلا خوف تردید کہی جاسکتی ہے کہ مولانا مودودی نے کوئی نئی (Original) بات نہیں کی بلکہ وہی باتیں جو علامہ اقبال نے اپنے اردو اور فارسی اشعار میں کہی ہیں، انہی کی تشریح و توضیح اپنی سادہ اور عام فہم اردونتر میں سید مودودی نے کر دی ہے بلکہ ان کی بنیاد پر ایک علم الکلام ایجاد کر دیا ہے۔^{۱۰}

(یہ بات قابل بحث ہے البتہ چودھری مظفر حسین نے فکر اقبال کو جماعت اسلامی کی موجودہ فورس کے لیے قابل قبول بنانے کی جوسمی کی ہے وہ قابل تحسین ہے۔ انہوں نے ”اقبالیات“ کے تحت ایک سیریز میں اس حوالے سے قابل قدر کام کیا ہے)۔^{۱۱}

اقبال سے موازنہ کا مقصد یہاں ان بزرگوں کی فتح و نکست کی کہانی کو بیان کرنا نہیں ہے۔ یہ سطور ایک نئے تصور کی طرف اہل فکر و بصیرت کی توجہ مبذول کرانے کی سعی میں تحریر کی جا رہی ہیں۔ یہ نیا تصور فکر اقبال سے ماخوذ ہے اور اسی معرب کہ آرائی کا اگلا قدم ہے اس لیے یہ باور کرانا مقصد ہے کہ اقبال کی فکرتب بھی جاندار تھی اور عوامی امنگوں کی ترجمان بن گئی تھی۔ یہ فکر اب بھی زندہ اور تازہ دم ہے اور ہمیں سیاسی افکار کے میدان میں اس سے مزید رہنمائی مل سکتی ہے۔

اگلی سطور میں ”فکر اقبال فکر مستقبل ہے“ کے تحت برعظیم پاک و ہند کے اہل قلم و اہل بصیرت کے حوالے سے چند آراء کا بیان مقصود ہے جس سے یہ عیاں کرنا مراد ہے کہ فکر اقبال کی شمع روشن رکھنے والوں نے اپنی متاع حیات کو کیوں کھپایا۔ فکر اقبال ایک سنگ میل کیے بن گئی؟ جس کسی نے علوم مشرقی یا علوم مغربی سے آگاہی حاصل کرنا چاہی تو حتیٰ رائے کے لیے اس نے اقبال سے رجوع کیا۔ جو لوگ شاعری، فلسفہ، عمرانیات، سیاسیات، معاشیات، تہذیب و تمدن اور پاکستان کے

میدانوں میں مطالعہ کرتے آئے ہیں اور ان میں انھوں نے اپنا مقام بنایا ہے تو اقبال کے افکار کی چوٹی انھوں نے ضرور سرکی۔ پاکستان میں جس قدر اہل قلم و بصیرت کی تعداد و طاقت رہی ہے اس کا ایک حصہ تو مکمل طور پر اعلانیہ طور پر اقبال کی فکر کی پیروی اور اس کی توضیح و تشریح کا دعویٰ کرتا آیا ہے۔ یہ تعداد کسی صورت بھی میسر اہل علم و فکر کی پچاس فیصد سے کم نہ ہوگی۔ جبکہ دوسرا حصہ مزید دو حصوں میں منقسم ہو جاتا ہے۔ ایک وہ جنہیں ہم مذہبی یا مدرسی سکالر یا علماء کہتے ہیں اور جو کسی نہ کسی مکتب فکر سے بختی سے مسلک ہوتے ہیں۔ جماعت اسلامی کے مکتب فکر کے علاوہ کسی اور نے اقبال کے خلاف صاف بندی نہیں کی۔ یہ علماء جب بھی جدید دور میں اسلام کے حوالے سے گفتگو کرتے ہیں اقبال کو نظر انداز نہیں کرتے۔ جماعت اسلامی نے اقبال کو نظر انداز کیوں کیا اس پر تجزیہ ان سطور میں موجود ہے۔ اس کے علاوہ شاید بہت ہی مختصر سا حلقة ہے جو اقبال کی فکر کے ایک پہلو یا ایک سے زائد پہلوؤں سے اتفاق نہ رکھتے ہوں اور یہ علمی بات ہے۔ اس بات کی تصدیق ہے کہ کوئی اور صاحب فکر ابھی ہماری فکری صفوں میں طوفان برپا نہیں کر سکا۔ یہ اقبال ہی ہے جو ابھی پوری طرح سوچوں کوئی سمت اور ولہ دینے کے لیے تیار ہے۔ چند اہل قلم و بصیرت کے اقبال سے متعلق افکار کے نمونہ جات پیش خدمت ہیں جس کے لیے کوئی خاص ترتیب نہیں رکھی گئی ہے۔

مولانا سید سلیمان ندوی اقبال کی رحلت پر لکھتے ہیں اور کیا خوبصورت خراج عقیدت پیش کرتے ہیں۔ ”نظریے ان سے بنیں گے اور ان کا فلسفہ تیار ہوگا“، یہ مستقبل کے حوالوں کی باتیں تھیں۔ وہ لکھتے ہیں۔

اقبال کی تصنیفات زمانے میں یاد رہیں گی۔ ان کی شریں لکھی جائیں گی۔ نظریے ان سے بنیں گے، ان کا فلسفہ تیار ہوگا۔ اس کی دلیلیں ڈھونڈی جائیں گی، قرآن پاک کی آیتوں، احادیث شریفہ کے جملوں، مولانا (رومی)، حافظ و حکیم سنائی کے تاثرات سے ان کا مقابلہ ہوگا۔ اقبال صرف شاعر نہ تھا، وہ حکیم نہیں جو اس طوکی گاڑی کا قلی ہو یا یورپ کے نئے فلاسفوں کے خوشہ چیس بلکہ وہ حکیم جو اسرار کلام الہی کے محرم اور رمز شریعت کے آشنا تھے۔ اقبال ہندوستان کا فخر اقبال، اسلامی دنیا کا ہیر و اقبال، فضل و کمال کا پیکر اقبال، حکمت و معرفت کا دانا اقبال، کاروان ملت کا رہنماء اقبال۔^{۱۲}

ڈاکٹر شجاع ناموس نے ۹ جنوری ۱۹۳۸ء بروز اتوار عباسیہ لٹریری لیگ کے تحت ”اقبال ڈے“ پر ایک پیکھر دیا۔ وہ لکھتے ہیں۔

کس قدر حیرت انگیز معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہستی جس کو لوگ صرف شاعر سمجھتے ہیں، اتنا بڑا اسلام کا عالم ہو، کہ لوگ مذہبی رسائل اور کتب لکھنے کے بعد ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں یہ دریافت کرنے کے لیے ارسال کرتے کہ ان میں کوئی بات خلاف شرع اسلام تو نہیں، تاکہ ہم اسے رسالہ میں سے خارج کر دیں۔ حتیٰ کہ انہیں حمایت اسلام اس چشمہ فیض کی ممنون ہے۔ میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ باسفورس سے اس طرف شاید ہی کوئی عالم مل سکے جسے اسلامیات پر اس قدر عبور حاصل ہوا اور اسے اسلام کی الہیات، سیاست، تاریخ غرضیکہ اسلام کے تمام شعبوں کے متعلق اس قدر وسیع معلومات حاصل ہوں۔ اس وسعت نگاہ کو دیکھ کر جو فوق العادہ معلوم دیتی ہے۔ یہ خیال ہوتا ہے کہ انسانی قدرت سے باہر ہے۔ ہمارے ایک دوست کہا کرتے ہیں کہ اگر رسول عربی ﷺ کے بعد کسی پیغمبر کے ظہور کا امکان ہوتا میں کہتا کہ وہ اقبال ہے۔ اقبال بہت بڑا مفکر ہے، اس کا مضمون ایک عرصہ سے اسلام رہا ہے۔ اس کی گذشتہ موجودہ اور آئندہ حالت کا نقشہ وہ کھینچتا ہے۔ یہ کچھ دیتا ہے۔ وعظ و نصیحت کرتا ہے اور آئندہ کے لیے عالم اسلامی کے لیے لا جعل تیار کرتا ہے۔^{۳۲}

سابق ناظم اقبال اکادمی عبد الحمید کمالی اپنے مضمون ”جناب، اقبال اور تصور پاکستان“ میں لکھتے ہیں۔

ان کی دور میں نظر اس تہذیب کے ان گوشوں تک پہنچی جن سے اس کے کارخانہ وجود میں ہمہ ہمی قائم ہے۔ انہوں نے محسوس کیا کہ یورپ میں جہاں احترام آدمیت ہے وہاں جلب منفعت کی بھی میں پوری آدمیت جل رہی ہے اور مفاد پرستی کو ہمیت اجتماعی کے اصول کا درجہ حاصل ہے۔ چنانچہ سیاست و معیشت میں وہ ایک طرف جمہوریت پسند ہے تو دوسری طرف استعماریت کا دیویا استبداد۔ ملکوئی صفات اور ابلیسی خصالص کا یہ سنم "وطیت" کو اعلیٰ ترین قدر اور دیوتا بنانے سے ہوتا ہے۔ چنانچہ انہوں نے اب اپنے کلام کے ذریعہ قوموں کی تشكیل جدید پر زور دیا۔ وہ ہندوستان کو وطیت سے بچانا چاہتے تھے وطن دوستی سے نہیں۔ انسانی آبادیوں کی روحانی اور اخلاقی اصولوں پر نظم نوان کی فکر کا نصب العین بن گئی۔ ”شکوہ“ و ”جواب شکوہ“، ”شمع اور شاعر“ اور اسرار و رموز کی بنائے تصنیف یہی محرك ہے۔ آخرالذکر میں انہوں نے ملت اسلامیہ کی روحانی اساس واضح کی۔ وہ چاہتے تھے کہ نئے ہندوستان کی تشكیل و طیت پر نہ ہو بلکہ روحانیت پر ہو۔^{۳۳}

اقبال، عصر رواں کا عظیم ترین معلم دین کے تحت پروفیسر کرم حیدری منصب اقبال کے حوالے سے رقم طراز ہیں۔

علامہ مرحوم کے تمام ادبی کارناموں کا گھری نظر سے جائزہ لیں تو ہم پر یہ حقیقت بڑی وضاحت سے منکشف ہوتی ہے کہ اقبال کا حقیقی منصب ایک معلم دین کا ہے۔ انہوں نے اپنی نظم اور نثر دونوں کے ذریعے لوگوں تک علم دین پہنچانے کی کوشش کی ہے۔ یہ کوشش بڑی منظم، مربوط اور مسلسل ہے اور اس کی تہہ میں اقبال کا کمال خلوص پوری طرح کارفرما ہے۔ اپنے کمال خلوص کی بناء پر اقبال کی سطح معلمی بہت بلند ہے اور وہ اس منصب میں رسول پاک ﷺ کے منصب سے براہ راست مستفیض نظر آتے ہیں۔^{۱۵}

ڈاکٹر سید عبداللہ لکھتے ہیں۔

اقبال کا سب سے بڑا کارنامہ ان کی مفاہمتی تطبیقی جامعیت پسندی ہے۔ یعنی یہ کہ وہ مختلف اور متضاد نقطے ہائے نظر میں اپنی غایت فکری کے حوالے سے ایک طرح کی مفاہمت پیدا کرنے کے عادی ہیں۔ وہ اسلامی اور مغربی حکمت کے مختلف نظریات کی تنقید بھی کرتے ہیں اور ان تنقیدات کے اندر سے اپنا ایک جامع تصور بھی مرتب کرتے ہیں جس کا رخ علوم کے لحاظ سے یک طرف نہیں ہوتا بلکہ ہمہ جہت ہوتا ہے اور اس میں متعدد نظریات کے توانا حصے شامل ہو جاتے ہیں۔ اقبال کی غایت فکری موجودہ سامنسی تجربی دور میں اسلام اور قرآن کی فکری و ایمانی روح کا اثبات ہے۔ لہذا ن کی جملہ فکری و اجتہادی جدوجہد اسی ایک منہاج اعلیٰ کی حقانیت کی تصدیق کے لیے ہے۔

آج کے مشکلکی دور میں، مغربی افکار کی سب سے بڑی کوشش یہ ہے کہ مذہب کی بنیاد یعنی وحی والہام کی حقیقت کو سامنسی دلائل سے ختم کر دیا جائے۔ اقبال نے جو وحی والہام پر ایمان رکھتے ہیں اسی لیے مشکلکیں کی دلیلوں کو رد کر کے، غیر معمولی جوش و خروش سے وجود انی بنياد کا اثبات و استحکام کیا ہے۔^{۱۶}

ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم لکھتے ہیں۔

اقبال کے افکار میں اتنا تنوع اور ثروت ہے کہ اگر اس کے تفکر و تاثر کے ہر پہلو کی توضیح و تشریع اختصار سے بھی کی جائے تو ہزار ہا صفحات بھی اس کے لیے کافی نہیں۔ وہ مشرق و مغرب کے کم از کم سہ ہزار سالہ ارتقاء فلکر کا وارث ہے۔^{۱۷}

اقبال کے کلام سے بعض افراد کی زندگی میں ایک انقلاب آفرین یہ جان پیدا ہوا۔ آئندہ بھی ملت اسلامیہ کے ہر انقلاب میں اقبال موجود ہو گا۔^{۱۸}

میرے نزدیک اقبال کے عارفانہ اور عاشقانہ کلام کا ہر شعر عبادت میں داخل ہے۔^{۱۹}

پروفیسر محمد منور اپنے مضمون ”علامہ اقبال بحضور قرآن“ کا آغاز ان الفاظ سے کرتے ہیں۔

ہر اس شخص کے نزدیک قرآن دانش و حکمت کا سب سے بڑا اور لازوال سرچشمہ ہے جس کا اس امر پر یقین، یقین کامل ہے کہ قرآن اللہ کی کتاب ہے۔ یہی حال خود حضرت علامہ کا ہے۔ جب انہوں نے فکری زندگی میں بلوغت حاصل کی، انہیں احساس ہوا کہ اب وہ زندگی کے اسرار کو سمجھنے کے کسی حد تک اہل ہیں تو ان کا دل بول اٹھا کر وہ دانش جو قرآن کے سراج منیر سے فیض حاصل نہیں کرتی، ناقص ہے اور اس لیے ناقص ہے کہ وہ مدد و دذہ بن اور فانی فکر کے مالک فانی وجود کی سوچ ہے۔^{۲۰}

ڈاکٹر جمیل جالبی لکھتے ہیں۔

اقبال سے پہلے اور اقبال کے زمانے میں دنیا کی عظیم ترین فکر موجود تھی مگر اقبال کسی فکر کے شارح نہیں تھے۔ وہ ایک ایسے زندہ اور بصیر انسان تھے جنہوں نے اپنے ماضی کے سرمایہ علمی کو اپنے عہد کے تقاضوں کے مطابق اپنی بصیرت کی روشنی میں دیکھا۔ اس کے ہوئے اور کھرے کو؛ لگ کیا اور اس پر تنقیدی نگاہ ڈال کر اس میں خود اپنی فکر و نظر کا اضافہ کیا۔ ہمیں اقبال کو بھی اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے سچے اور زندہ تجربات کی روشنی میں دیکھنا ہے اور اقبال ہی کی پیروی میں اقبال کو نقد و نظر کی کسوٹی پر پرکھنا ہے یقین کیجئے اس سے اقبال کی قدر و منزلت میں اضافہ ہو گا اور اقبالیات سے وہ فرسودگی اور ایک رنگی دور ہو سکے گی جس کی شکایت اب بہت ہو گئی ہے۔^{۲۱}

ڈاکٹر طاہر حسین نے اقبال اور مشہور ناپینا عربی شاعر ابوالعلاء معزی کو خراج عقیدت ان الفاظ میں پیش کیا ہے۔ خورشید رضوی نے اسے ترجمہ کر رہا ہے اور پ میں ڈھالا ہے۔ لکھتے ہیں۔

اہل اسلام میں دو شاعر ایسے ہو گز رہے ہیں جنہوں نے اسلامی ادب کا پایہ آسمان تک پہنچا دیا اور اس کی عظمت کا نقش جبین وقت پر ثابت کر دیا۔ ایک ہندو پاک کا شاعر اقبال اور دوسرے دنیاۓ عرب کا شاعر ابوالعلاء۔ یہ دو ایسے شاعر ہیں کہ ایک دوسرے سے انتہا درجے کی ممائت رکھتے ہیں مگر ساتھ ہی ساتھ ایک دوسرے سے انتہائی مغارت بھی رکھتے ہیں۔ دونوں بنیادی طور پر شاعر ہیں، دونوں فلسفی ہیں اور دونوں نے فلسفے کو شعر کے اور شعر کو فلسفے کے تابع کر دکھایا حالانکہ ان دونوں عظیم الشان شعبوں میں مطابقت پیدا کرنا از بس دشوار ہے۔ دونوں نے تصوف کو اختیار کیا تا آنکہ اس میں غایت درجے کی دسترس حاصل کی اور پھر اس کے بعد دونوں نے فرسودہ تصوف کی مقلدانہ روشن کے خلاف علم بغاوت بلند کیا اور جادہ تصوف پر اپنے لیے ایک خاص مسلک نکالا جس میں کوئی دوسرا ان

کا شریک نہ تھا۔ دونوں نے پورے زور شور سے اپنی شخصیت کا اثبات کیا اور انسان کو اس بات کی دعوت دی کہ وہ اپنی ذات کو اس طرح پہچانے جس طرح پہچانے کا حق ہے اور اپنا نقش دنیا پر اور لوح زمان پر ثبت کر دے اور اپنی ذات کو کسی بھی دوسرا ذلت میں خواہ وہ کوئی بھی ہو، فنا نہ ہونے دے۔^{۲۲} مگر بس اس سے آگے دونوں کے درمیان شدید اختلاف و مغایرت کی خلیج حائل ہے۔^{۲۳} ڈاکٹر وحید اختر شعبہ فلسفہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ اپنے مضمون ”اقبال اور اسلامی فکر کی تشكیل نو“ کا آغاز کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

اقبال نے ”اسلام میں مذہبی فکر کی تشكیل نو“ کے عنوان سے نئے تقاضوں کی روشنی میں اجتہاد کا ایک لائے عمل اور اس کے کچھ اساسی اصول پیش کیے۔ ہندوستان میں اسلام کی تفسیر نو کا سلسلہ شیخ احمد سر ہندی سے ہوتا ہوا شاہ ولی اللہ، شبلی اور سر سید تک پہنچتا ہے۔ اقبال اسی سلسلے کی آخری کڑی ہیں۔ انہاروں میں صدی کے آغاز سے عرب اور افریقی مسلم ممالک میں اسلام کی تشكیل نو کی تحریکیں اٹھنی شروع ہو گئی تھیں جن کا نقطہ عروج پان اسلامیت ہے۔ اقبال کا اس تحریک سے بھی ڈھنی رشتہ تھا۔ اقبال نہ صرف ان اسلامی تحریکوں کے موید تھے بلکہ انہوں نے مغرب میں سائنس و فلسفہ، صنعت اور نیکنا لو جی کے فروع کا بھی گہرا جائزہ لیا تھا۔ وہ بیسویں صدی میں مغربی تہذیب کے زوال سے بھی آشنا تھے۔ انہوں نے مغرب کی فکری اور سیاسی تاریخ سے بھی استفادہ کیا۔ وہ مغرب کو کہیں رد کرتے ہیں اور کہیں قبول۔ رد و قبول کے اس عمل میں ان کے سامنے اسلام کی نشانہ ثانیہ کا نصب لعین ہی رہتا ہے۔ مجموعی طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ انہوں نے اسلامی تہذیب کی روح کو ہمیشہ مغرب کی روح سے مختلف سمجھا۔ اختلاف کے اس عرفان نے انہیں جدید مغربی علوم کی روشنی میں اسلام کی اصل روح کی بازیافت پر اکسایا۔ وہ مغرب کے یکسر منکرنہیں۔ اس سے سائنسی علوم سیکھنا چاہتے ہیں۔ کیونکہ یہ مسلمان کی اپنی گمشدہ میراث ہے لیکن وہ مغربی مادی ترقی کو یک رخ ارتقاء سمجھ کر اسلام کے ارتقاء کو مستقبل کے لیے روحانی راستے پر گامزن دیکھنا چاہتے ہیں۔ اقبال کے یہاں روحانیت یا مذہبیت روح و مادے کا تناقض نہیں بلکہ دونوں کی ہم آہنگی سے عبارت ہے اور یہی ان کے نزدیک اسلام کی روح ہے۔^{۲۴}

حوالی

- ۱۔ آغا صادق، اقبال، بزم اقبال، لاہور، شمارہ اکتوبر ۱۹۶۰ء، ص ۱۱۱
- ۲۔ اقبالیات، شمارہ جنوری تا مارچ ۲۰۰۳ء، اقبال اکادمی، لاہور، ص ۳۱
- ۳۔ ابوالکلام آزادی، آزادی ہند، ص ۳۲۶
- ۴۔ ایضاً، ص ۳۲۷
- ۵۔ ایضاً، ص ۳۲۸
- ۶۔ ایضاً، ص ۳۲۸
- ۷۔ اقبالیات، شمارہ جنوری تا مارچ ۲۰۰۳ء، ص ۳۱
- ۸۔ ایضاً، ص ۱۸
- ۹۔ چوہدری مظفر حسین، پاکستان، نفاذ اسلام اور اقبال، ۱۹۹۳ء، بحوالہ جماعت اسلامی کا ایک گشیدہ باب از ڈاکٹر اسرار احمد، ۱۹۹۱ء، ص ۲۹
- ۱۰۔ چوہدری مظفر حسین، پاکستان کی دینی سیاست، ۱۹۹۶ء، لاہور، ص ۷۲
- ۱۱۔ چوہدری مظفر حسین کی کتب (۱) اساسی فکر اقبال (۲) روحانی جمہوریت (۳) پاکستان تجربہ گاہ اسلام (۴) خودی اور آخرت کا مطالعہ مفید رہے گا۔
- ۱۲۔ مولانا سید سلیمان ندوی، بحوالہ اقبال کے متعلق اہل مدرسہ کاظمیہ، "از وحید الدین اقبالیات، ۱: جنوری ۲۰۰۰ء، ص ۱۳۰
- ۱۳۔ ڈاکٹر شجاع ناموس، اقبالیات، ۲۰۰۳ء، جولائی ۲۰۰۳ء، ص ۷
- ۱۴۔ عبدالحمید کمالی، اقبال رویویو، جنوری ۱۹۷۳ء، ص ۱۰
- ۱۵۔ پروفیسر کرم حیدری، اقبال رویویو، جولائی ۱۹۸۰ء، ص ۲
- ۱۶۔ ڈاکٹر سید عبد اللہ، صحیفہ اقبال، مرتبہ یونیورسیٹی جاوید، ۱۹۸۶ء، ص ۲
- ۱۷۔ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم، فکر اقبال، ص ۷۵
- ۱۸۔ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم، فکر اقبال، ص ۵۰۵
- ۱۹۔ ایضاً، ص ۵۰۳
- ۲۰۔ پروفیسر محمد منور، صحیفہ اقبال، ص ۱۵۶
- ۲۱۔ ڈاکٹر جیل جالبی، صحیفہ اقبال، ص ۱۷۳
- ۲۲۔ ڈاکٹر طہ حسین، صحیفہ اقبال، ص ۳۶۵
- ۲۳۔ ڈاکٹر وحید اختر، اقبالیات، مارچ ۱۹۹۲ء، ص ۳

مولانا ابوالکلام آزاد کی شاہکار تصانیف

تفسیر ترجمان القرآن (تین جلدیں)	فсанہ بھروسہ	مولانا ابوالکلام آزاد کی شاہکار تصانیف
ام الکتاب (تفسیر سورۃ فاتحہ)	ارکان اسلام	
مقام دعوت (ترجمہ و تفسیر)	قرآن حکیم کی تین سورتیں	
غار خاطر	انسانیت موت کے دروازے پر	
تذکرہ	رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور	
خطبات آزاد	خلفے راشدین کے آخری محنت	
آزادی ہند	اسلام میں آزادی کا تصور (الحریت فی الاسلام)	
مسئلہ خلافت	شہادت حسین رضی اللہ عنہ	
قول فیصل	اصحاب کہف اور یا جون و ماجون	
قرآن کا قانون عروج و زوال	ذکر آزاد (مولانا ابوالکلام آزاد کی رفاقت میں ۳۸ سال)	
حقیقت الصلة	آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی	
ولادت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم	تصورات قرآن	
مسلمان عورت	مولانا آزاد کے سائنسی مضامین	
صدائے حق (امر بالمعروف و نهی عن المنکر)		
میں کیا کہا	مولانا آزاد ابوالکلام نے پاکستان کے بارے	

ادارے کی دیگر کتب

مرزا سدالنہ خاں غالب	ویوان غالب (پاکٹ)
مرزا سدالنہ خاں غالب	ویوان غالب (فرینگ کے ساتھ)
علامہ محمد اقبال	کلیات اقبال (فرینگ کے ساتھ)
میاں محمد بخش / محمد خلیل ثاقب	آئینہ سلوک (مطلوب سیف الملوك)
پروفیسر ڈاکٹر محمد سعود عالم قاسمی	عصر حاضر میں اسوہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی معنویت
اشیخ خالد البیطار / مولانا سعید الرحمن علوی	خلفاء راشدین
مولانا محمد منظور نعمانی	خطبات سببی
مرتبہ: محمود الحسن صدیقی اچراغ حسن حضرت	تاریخ اسلام (زمانہ قبل اسلام سے عصر حاضر تک)
محمد مظہر الدین صدیقی	اسلام کا نظریہ تاریخ
میاں محمد شفیع	1857ء پہلی جنگ آزادی
سید علی خامنہ ای	ہندوستان کی جدوجہد آزادی میں مسلمانوں کا حصہ
ڈی۔ ایچ۔ ونسن / پروفیسر افتخار احمد	ہزارہ گزیٹری
ڈاکٹر شیر بہادر خان پنی	تاریخ ہزارہ
مرزا سلطان احمد	فتوں لطیفہ
منصف خان حاب	وادی کاغان (تاریخ 5 لوگ 5 ثقافت 5 ساخت)
محمد پرویش شاہین	مشرق کا سوئزر لینڈ وادی سوات
محمد پرویش شاہین	کافرستان کے رسم و رواج
محمد پرویش شاہین	سوات کوہستان
محمد پرویش شاہین	وادی دری کوہستان
محمد پرویش شاہین	وادی چترال
ای ایف نائٹ اظفر حیات پال	جہاں تین سلطنتیں ملتی ہیں
آسیہ آرزو	پروفیشنل بیویشن بنیتے

پاکستان سے اقبال تک

پاکستان کا مستقبل اور اقبال

پروفیسر محمد عارف خان



مکتبہ جمال

تیری منزل، حسن مارکیٹ، اردو بازار، لاہور



MAKTABA JAMAL

Mob. 0300-8834610 Tel. 042-7232731
maktaba_jamal@email.com/maktabajamal@yahoo.co.uk